Regd. L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1969

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی!

"خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا تھا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کیلئے جو قوانین دئیے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اسکے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور نہ کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو"

(معراجِ انسانیت ۔ پرویز)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

سالانہ ــــ پاکستان ــــ دس روپے

سالانہ ــــ ہندوستان ــــ پندرہ روپے

سالانہ ــــ غیر ممالک ــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ۔ ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵۔ بی۔ گلبرگ، لاہور

جلد (۲۲) — جون ۱۹۶۹ء — نمبر (۶)

فہرست

(۱) لمعات ــــــــــــــــــ ۲

(۲) انقلابِ محمدی ــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــ ۹

(۳) علامہ عبدالرحمٰن الکواکبی ــــــ (شاہد عادل) ــــــ ۳۳

(۴) سادگی و پرکاری ــــــــــــ ۴۶

(۵) اسلامی نظریۂ قومیت ــــــ (مسٹر نرود بسی چودہری) ــــــ ۵۲

(۶) استعمار کا عالمی کردار ــــــ (محترم خورشید عالم صاحب) ــــــ ۵۸

(۷) باب المراسلات ــ دکانیں پر قرق (ہمارا تاریخی ورثہ ــ پاکستان میں نظامِ زکوٰۃ) ــــــ ۶۷

(۸) حقائق و عبر ــ (ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم) ــ (خدا کی آواز) ــ (کارخانوں میں مزدوروں کے فسادات) ــ (قرآنی معاشرہ) ۷۳

(مینار کی بنیادیں آیا بیت تزلزل) ــــــ

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبع اشرف پریس۔ ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح پاکستان کے خطۂ زمین کی موہبت فطرت کے کسی اپنے پروگرام کی ایک کڑی تھی، اسی طرح اس کی حفاظت بھی اس نے اپنے ہی ذمے رکھی ہے ورنہ ہم تو اس کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ۱۹۵۸ء میں جب حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎ ہر قدم پر تھا گماں 'یاں رہ گیا' 'واں رہ گیا'۔ عسکری انقلاب نے اسے مرتے مرتے بچا لیا۔ اگر اس وقت یہ قدم نہ اٹھایا جاتا تو انڈیا کو شاید ۱۹۶۵ء کی یلغار کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اور اگر ضرورت پڑتی بھی، تو اس جنگ کا نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اسی طرح جو صورت حالات اب پیدا ہو چکی تھی، اگر فوجی نظام مداخلت نہ کرتا تو معلوم ہمارا حشر کیا ہو چکا ہوتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء چار سال تک رہا لیکن کسی کی چھنگلی سے خون کا ایک قطرہ تک نہ بہا۔ اور اس مرتبہ کا مارشل لاء اس سے بھی زیادہ سہل انگیز اور نرم رو ہے۔ یہ اس ملک کی کتنی بڑی خوش بختی ہے! خدا کرے کہ اس کے بعد ہم سنبھل جائیں کہ فطرت جہاں اپنی موہبت میں اس قدر فیاض واقع ہوتی ہے، وہاں اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہوتی ہے۔ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا) مارشل لاء کسی ملک کی خرابیوں کا مستقل علاج نہیں ہوتا۔ یہ تو مریض کو بچانے کی ہنگامی تدبیر ہوتی ہے۔ ۱۹۵۸ء کی ہنگامی تدبیر سے جب مریض کی حالت خطرہ سے باہر (OUT OF DANGER) ہو گئی تھی، تو ہمیں چاہیئے تھا کہ اس کے مستقل علاج کی فکر کرتے۔ ہم نے اس کی طرف سے مجرمانہ تغافل برتا، تو مرض پھر عود کر آیا، اور اس مرتبہ اس کا حملہ پہلے سے بھی زیادہ شدید ہوا۔ اب پھر ہنگامی تدبیر نے اسے سنبھالا دے دیا ہے۔ یہ مقام تشکر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد ہم پھر وہی کچھ کریں گے جو پہلے کیا تھا؟ حالات سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ پھر وہی کچھ ہوگا۔ جو لوگ اس ملک کی بہی خواہی کا دعوے لے کر اٹھے تھے اگر وہ فی الواقعہ اس کے بہی خواہ ہوتے تو انہیں فرصت کے ان لمحات کو (یا یوں کہیئے کہ مہلت کے اس

وقفہ کو جو فطرت نے ہمیں عطا کر دیا ہے) غنیمت سمجھنا چاہیئے تھا' اور انہیں مل بیٹھ کر سوچنا چاہیئے تھا کہ ملک کی بہبود کے لئے کوئی مستقل تدبیر اختیار کی جائے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ کس طرح چین کی نیند سو رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کا مقصد وحید ایوب خان کو برطرف کرنا تھا۔ وہ مقصد حاصل ہو گیا تو ملک کے سب دکھ دور ہو گئے۔ اب یہ اس انتظار میں ہیں کہ الیکشن ہوں اور یہ اس خالی کرسی کو جھپٹ لیں۔ جس ملک کے "خیر خواہوں" کا یہ عالم ہو' ان سے ملک کی خیر خواہی کی امید رکھنا' خود فریبی سے زیادہ کیا ہے؟

(۰)

مارشل لاء حکام نے اس وقت تک جس حسنِ تدبیر اور ضبطِ خویش سے کام لیا ہے' اس کے لئے قوم کا حساس طبقہ ہمیشہ ان کا ممنونِ منت رہیگا۔ وہ جو اصلاحی قدم اٹھائے ہیں' ان کے نتائج دھیرے دھیرے برآمد ہونگے۔ اس سلسلہ میں ہم ان کی خدمت میں چند ایک گزارشات مشورۃً پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے وہ انہیں اپنی توجہ کا مستحق قرار دیں گے۔ حکومت کے جو واجبات لوگوں نے ادا نہیں کئے تھے' ان کی وصولی نہایت ضروری تھی۔ اس کے لئے ضروری احکام اور ہدایات نافذ ہوتے ہیں اور ان کے مطابق عملدرآمد بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک ضروری نکتہ قابلِ غور ہے۔ (مثلاً) تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ کسی محکمہ کا ایک کروڑ روپیہ پبلک کے ذمہ واجب الادا ہے۔ پبلک سے کہا گیا کہ وہ فلاں تاریخ تک اپنی اپنی رقوم ادا کر دیں ورنہ ان کے خلاف تعزیری کارروائی کی جائے گی۔ یہ اقدام بالکل مناسب اور ضروری تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس تمام دوران میں وہ محکمہ موجود تھا جس کے واجبات پبلک نے ادا نہیں کئے۔ اس محکمہ کے کارپرداز جن کے ذمے ان واجبات کا وصول کرنا تھا' حکومت کے خزانے سے اپنی تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ اس محکمہ کے قواعد وضوابط میں وضاحت سے لکھا تھا کہ کسی رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں' فلاں افسر کو یہ کرنا ہوگا اور فلاں کو یہ۔ ان قواعد وضوابط میں اتنا ہی نہیں لکھا تھا کہ پبلک کو یہ رقوم ادا کرنی ہوں گی۔ ان میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر پبلک ان رقوم کو ادا نہ کرے تو اس کے لئے عمالِ حکومت کو کیا کرنا ہوگا۔ پبلک نے وہ رقوم ادا نہ کیں تو انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا۔ لیکن ان رقوم کی وصولی کے سلسلہ میں' جس ملازم سرکار نے وہ کچھ نہ کیا جو کچھ اسے کرنا چاہیئے تھا' اس نے بھی تو جرم کا ارتکاب کیا۔ اگر وہ اپنے فرائض کو ــــ جس کے لئے وہ حکومت کے خزانے سے معاوضہ لیتے تھے ــــ ٹھیک ٹھیک طور پر سرانجام دیتے، تو نہ پبلک کے ذمہ اس قدر رقوم واجب الادا ہوتیں' اور نہ ہی مارشل لاء حکام کو ان کی وصولی کے لئے اتنا وقت اور توانائی صرف کرنی پڑتی۔ جو احکام مارشل لاء حکام نے نافذ کئے ہیں ــــ یعنی جو شخص اپنی واجب الادا رقم فلاں تاریخ تک ادا نہیں کرے گا اس

کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی ــــ وہ اس سے پہلے متعلقہ محکمے کے ضابطہ میں موجود تھے۔ اب وصولی اس لئے ہو رہی ہے کہ مارشل لاء سے متعلق عمال اپنے فرائض ادا کرتے ہیں ــــ یعنی وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے جاری کردہ احکام پر عمل ہو رہا ہے ــــ سابقہ عمالِ حکومت نے یہ نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ بقایا کی وصولی کے سلسلہ، اس قسم کے ملازمین سرکار کے خلاف کیا کارروائی کی جا رہی ہے؟ قرآن کریم تو اس قسم کے مجرمین کو دوہری سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے ــــ ایک ان کے اپنے جرائم کی سزا، اور ایک سزا لوگوں کے ان جرائم کی جو ان کی فرض ناشناسی اور تغافل شعاری کی وجہ سے سرزد ہوئے۔ لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ (۱۶/۲۵)

(۰)

مارشل لاء حکام کی طرف سے اس قسم کے احکامات صادر ہوتے رہتے ہیں کہ پبلک میں سے جس نے اپنی فلاں ذمہ داری کو پورا نہیں کیا، وہ اسے پورا کرے ورنہ اس کے خلاف تعزیری کارروائی کی جائے گی۔ ایسے احکام ضرور نافذ ہونے چاہئیں تھے لیکن سوال یہ ہے کہ سرکاری محکموں کی بھی بعض ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ جو محکمہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے، یا غفلت، دھاندلی سے کام لے، اس کے متعلقہ افسروں کے خلاف بھی تو اسی قسم کی کارروائی ہونی چاہیئے۔ (مثلاً) اگلے دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ محکمہ ٹیلی فون کے اس قدر بل پبلک نے ادا نہیں کئے۔ انہیں وارننگ دی گئی کہ اگر انہوں نے ان رقوم کی ادائیگی نہ کی تو ان کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی خبر درج تھی کہ محکمہ نے بہت سے ٹیلی فون کنکشنز ان لوگوں کے کاٹ رکھے ہیں جنہوں نے اپنے تمام بلوں کی ادائیگی بروقت کر دی تھی اور ان کے ہزار واویلا کے باوجود ان کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ جو ملازمین سرکار اس قسم کی دھاندلی کے مرتکب ہوتے ہیں ان کے خلاف کیا کارروائی کی جا رہی ہے؟ رشوت کے اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو کسی محکمہ سے ناجائز مفاد حاصل کرنے کے لئے رشوت دیتے ہیں یہ رشوت دیتے ہیں تو اسکے عوض کئی گنا زیادہ فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن دوسری قسم کے رشوت دینے والے وہ لوگ ہیں جو نہ کبھی قانون شکنی کرتے ہیں۔ نہ ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے کسی کے دروازہ پر دستک دیتے ہیں۔ وہ قانون کے ہر تقاضا کو پورا کرتے ہیں۔ اپنے واجبات کو بروقت ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ دھاندلی ہوتی ہے۔ وہ دھاندلی کے خلاف فریاد کرتے ہیں اور ان کی فریاد سنی نہیں جاتی۔ اس طرح وہ مجبور کر دیئے جاتے ہیں کہ کچھ دے دلا کر اس دھاندلی کے مضرات سے بچیں۔ جن لوگوں کے کنکشنز بلوں کی بروقت ادائیگی کے باوجود کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ وہ بیچارے اسی زمرے میں آتے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے عمالِ حکومت بھی دوہری سزا کے مستحق ہیں۔ ایک دھاندلی کے جرم کی سزا اور دوسری اس جرم کی سزا جس کا ارتکاب رشوت دینے والے سے مجبوراً کرایا گیا۔ مارشل لاء حکام کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اس قسم کا کوئی ایک (TEST CASE) لے لیں اور دھاندلی ثابت ہونے پر، متعلقہ کارپردازانِ حکومت کو ایسی سخت سزا دیں جو دوسروں کے لئے موجبِ صد عبرت ہو۔ اصلاح اسی سے ہوسکے گی۔

(۱)

مارشل لاء حکام کا ہر اصلاحی اقدام موجبِ صد تشکر و امتنان ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک، سب سے مقدم کام، عوام (MAN IN THE STREET) کی مشکلات کا حل ہے۔ ان مشکلات میں، ہر وقت، اور ہر ایک کو پیش آنے والی مشکل، روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی قیمتوں کی ہوشربا گرانی ہے جس (مزدور تو ایک طرف) متوسط آمدنی کے "سفید پوش" بال بچے دار کو دال تک روپے سوا روپے سیر ملے، سوچئے کہ وہ زندگی کے دن کیسے کاٹتا ہے؟ اور اس گرانی کے ساتھ جب اشیائے خورد و نوش خالص بھی نہ ملیں، تو اس کی اور اس کے بچوں کی صحت پر جو مضر اثر پڑتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ قوم کی اکثریت پر یہی کچھ بیت رہا ہے۔ یہ طبقہ مارشل لاء کے حق میں دعائیں دے گا اگر انہیں زندگی کی ضروریات، ان کی آمدنی کے اندر میسر آسکیں۔ یہ بیچارے نہ محلات چاہتے ہیں نہ کاریں، نہ قالین مانگتے ہیں نہ صوفے۔ نہ ریشمی ملبوسات کے خواہاں ہیں نہ سامانِ آرائش و زیبائش کے متمنی۔ یہ صرف شریفانہ طور پر جینا چاہتے ہیں اور جینے کی ضروری اشیاء کے لئے ترستے ہیں۔ اگر مارشل لاء کے اربابِ حل و عقد ان کے لئے اتنا ہی کر دیں تو ہمارے عسکری نظام کو بقائے دوام حاصل ہو جائے کہ قرآن کے اٹل فیصلہ کی رو سے، فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ مَا يَنفَعُ النَّاسَ — ثبات و دوام صرف اس کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہے۔

(۱)

مارشل لاء اتھارٹیز نے بار بار اعلان کیا ہے کہ ان کے پیشِ نظر انتخابات کے لئے فضا ہموار کرنا ہے تاکہ قوم کے نمائندگان کی مجلس، ملک کے مستقبل کے لئے صحیح راہیں تراش سکے۔ ان کے اس قسم کے اعلانات، ان کی حسنِ نیت کا ثبوت اور قوم کے لئے بڑے خوش آئند ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بنیادی نقطہ قابلِ غور ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے اسباب و محرکات تھے جو ملک میں مارشل لاء کے متقاضی ہوئے اور وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے عسکری نظام کو اس اقدام پر مجبور کیا؟۔ اس میں شبہ نہیں کہ مختلف اسباب و علل کی بنا پر، مملکت کی نظم و نسق کی مشینری میں بڑی خرابیاں آچکی تھیں، لیکن مارشل لاء کے

مقتضی وہ ہنگامے تھے جو اس سے دو تین ماہ قبل ملک میں برپا کرائے گئے۔ جن لوگوں نے یہ ہنگامے برپا کرائے وہ ملک کے سامنے ہیں۔ اس وقت مختلف پولٹیکل پارٹیوں کی سرگرمیاں ممنوع ہیں، لیکن ان پارٹیوں کے سرکردگان یہیں موجود ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اپنی اپنی تنظیم کو مزید مستحکم بنانے کے لئے خاموشی سے مصروفِ کار ہوں گے۔ زود یا بدیر جب بھی الیکشن کرائے گئے، تو ان پارٹیوں کو الیکشن سے متعلق سرگرمیوں کی بہرحال اجازت دی جائے گی۔ اور ہمارے ہاں سیاسی سرگرمیوں کا لازمی نتیجہ ہنگامہ آرائی ہوتا ہے۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو گئی تو ڈر ہے کہ ان ہنگاموں کو فرو کرنے کے لئے مارشل لا اتھارٹیز کو قوت کا استعمال کرنا پڑے اور اس طرح وہ اس اقدام پر مجبور ہو جائیں جس سے بچنے کے لئے وہ اس قدر احتیاط برت رہے ہیں۔

یہ ساری خرابیاں پارٹیوں کے وجود سے پیدا ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے امت میں پارٹی سازی کی اس شدت سے مخالفت کی ہے۔ ہم نے پارٹی سازی مغرب کے سیاسی نظام سے مستعار لی ہے۔ اسلام میں اسکی قطعاً گنجائش نہیں۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں

> مسلمان قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیت پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ (پیغام حق، فروری ۱۹۳۸ء)

ان حالات میں نگاہ کا رُخ اسی طرف جاتا ہے کہ اگر ان پارٹیوں کو ممنوع قرار دے دیا جائے تو الیکشن پُرامن طریقے سے تکمیل تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اگر موجودہ لیڈروں کو آئندہ الیکشن میں بطور امیدوار کھڑے ہونے کا نااہل قرار دے دیا جائے تو اس سے امن کی مزید ضمانت بھی مل جائیگی، اور اُن پُرامن شہریوں کو اُبھرنے کا موقعہ بھی مل جائے گا جو اس وقت ان (لیڈروں) کے دباؤ کی وجہ سے عزلت گزینی پر مجبور ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں میں بڑی صلاحیتیں ہیں لیکن وہ صلاحیتیں اس وقت دب کر رہ گئی ہیں۔ وہ سیاسی پارٹیوں میں سے کسی کا ساتھ دے نہیں سکتے کہ اس کے لئے جس قدر قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اس کیلئے وہ تیار نہیں۔ اور تنہا رہ کر وہ کسی کا مقابلہ کر نہیں سکتے۔ ملک کی سیاست اسی صورت میں

اجلی سطح پر آسکتی ہے جب یہاں دبی ہوئی صلاحیتوں کو اُبھرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں، اور جوہرِ ذاتی، نہ کہ پارٹیوں کا وباؤ، معیارِ انتخاب قرار پائے۔ اگر ایک الیکشن بھی اس انداز کا ہو جائے تو اس طرح منتخب ہونے والے افراد اپنی صلاحیت اور دیانت سے ملک میں ایسی فضا پیدا کر دیں گے کہ اس کے بعد قوم کی نگاہوں میں حریصانِ اقتدار کی کوئی وقعت نہ رہے۔

لیکن اس تجویز کے راستے میں ایک خدشہ ہے جس کے احساس سے ہم اسے پیش کرنا قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے۔ وہ خدشہ یہ ہے کہ اس طرح الیکشن ہونے کے بعد، جب مارشل لا ختم ہو جائے گا تو ان پارٹیوں اور ان لیڈروں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ملک کے صحیح نمائندگان منتخب ہو کر نہیں آسکے اور اس طرح یہ پھر "بحالیٔ جمہوریت" کے لئے، حسبِ سابق تخریبی کارروائیوں پر اُتر آئیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ انہیں دوبارہ وہی کچھ کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ اندریں حالات، سیاسی پارٹیوں کو بھی علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے اور ان کے لیڈروں کو الیکشن کے لئے بھی نااہل قرار نہ دیا جائے "تاکہ یہ اپنے دل کی حسرت نکال لیں اور دیکھ لیں کہ قوم کس حد تک انہیں اپنا نمائندہ سمجھتی ہے۔ البتہ، الیکشن کے سلسلہ میں ان پر ایک پابندی ضرور لگا دی جائے اور وہ یہ کہ ہر پارٹی یا ہر امیدوار اپنے حق میں جو جی میں آئے کہے، لیکن کسی دوسری پارٹی یا دوسرے امیدوار کے خلاف کچھ نہ کہے ـــ بالفاظِ دیگر، اپنے لئے "زندہ باد" کہنے کا حق تو ہر ایک کو حاصل ہو لیکن "مردہ باد" کہنے کی اجازت کسی کو نہ دی جائے۔ اپنے اپنے مسلک و منشور کی تائید میں جو کچھ کوئی کہنا چاہے کہے، لیکن باہمی تقابل سے دوسروں کے مسلک و منشور پر تنقید یا انکی تنقیص نہ کی جائے۔ اسی قسم کی پابندی اخبارات پر بھی لگا دی جائے۔ اس طرح امید ہے کہ انتخابات کا انعقاد پُرامن طریق سے ہو جائے گا۔

(۰)

(۳)

ہمیں سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی، کیطرف سے حسبِ ذیل اعلان بغرضِ اشاعت موصول ہوا ہے جسے ہم بہ کمال مسرت شائع کرتے ہیں۔

"جیسا کہ احباب کو علم ہے، مفکرِ قرآن (محترم پرویز صاحب) کی زندگی کی آخری آرزو یہ ہے کہ ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جس میں یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ، طالب علموں کے دل و دماغ کو صحیح قرآنی قالب میں ڈھال کر یہ دکھایا جائے کہ اسلام اس قسم کے نوجوان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا جسے گورنمنٹ سے رجسٹرڈ کرا لیا گیا تھا اور حکومت نے

اس کی بھی منظوری دے دی تھی کہ جو عطیات اس سوسائٹی کو دیئے جائینگے وہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار پاجائینگے۔ اس کے بعد پہلا مرحلہ مجوزہ کالج کی عمارت کے لئے زمین کا حصول تھا۔ اس کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیش آتی رہیں جن کی وجہ سے اس اسکیم کے بروئے کار آنے میں تاخیر ہوگئی۔ للہ الحمد کہ اب حالات سازگار ہوگئے ہیں اور اس اسکیم پر بہت جلد عملدرآمد شروع کر دیا جائے گا۔ چونکہ اس سلسلہ میں سوسائٹی کو مختلف گوشوں سے استفسارات موصول ہو رہے تھے اس لئے ان جملہ احباب کی اطلاع کے لئے سردست یہ اعلان شائع کیا جارہا ہے۔ تفصیل ان امور کی آئندہ پیش کی جائے گی۔ ہم ان احباب کی خدمت میں جو مجوزہ کالج کے لئے عطیات یا کسی دوسری شکل میں امداد دینا چاہتے تھے، گزارش کریں گے کہ وہ اب اس کے لئے آگے بڑھیں اور اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں ہر ممکن کوشش فرمائیں۔ عطیات کراس چیک کی شکل میں حسب ذیل پتہ پر ارسال فرماتے جائیں ـــــ مرزا محمد خلیل صاحب - خزانچی قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور ـــــ والسلام!

(شیخ) سراج الحق سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔

طلوعِ اسلام

ـــــ ایک ماہوار رسالہ ہی نہیں۔ یہ ایک تحریک کا نقیب ہے۔

اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مملکتِ پاکستان میں وہ صحیح اسلامی نظام متشکل ہوجائے جو عہد رسالتمآبؐ و خلفائے راشدینؓ میں وجہ شادابی عالم ہوا تھا۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں اسلامی نظام کا صحیح تصور راسخ ہوجائے ـــ

ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر (مفکر قرآن پرویز صاحب کی تصانیف) ماہنامہ طلوعِ اسلام۔ پرویز صاحب کے خطابات۔ ان کا ہفتہ وار درس قرآن کریم (جو آج کل ہر اتوار کی صبح آٹھ بجے، ان کے مکان، واقعہ ۲۵/بی گلبرگ ۲ میں منعقد ہوتا ہے) سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ طلوعِ اسلام عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیتا۔ نہ ہی اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے ہے۔ اس کا مقصد قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے اگر آپ اس مقصد سے متفق ہوں تو اس کے ساتھ تعاون فرمایئے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۹

انقلابِ محمدیؐ

عیدمیلادالنبیؐ کی تقریبِ سعید (منعقدہ ۲۹ مئی ۱۹۶۹ء) پر

پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب

انقلابِ محمدیؐ

عزیزانِ گرامی قدر ۔ سلام و رحمت!

اس تقریبِ سعید میں شرکت سے آپ جس بخت و سعادت سے بہرہ یاب ہوئے ہیں، میں اس پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہوں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

عزیزانِ من! اسے حسنِ اتفاق کہیئے، یا نظامِ فطرت کے عظیم پروگرام کی ایک متعین کڑی، کہ حضور نبی اکرمؐ کا ظہورِ قدسی جس ماہ یا موسم میں ہوا (یعنی الربیع الاول) اس سے عربوں کے ہاں موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی اُس موسم کا آغاز جس میں ہر شاخِ خزاں دیدہ سے عروسِ زندگی از سرِ نو تبسم ریز و قہقہہ بار ہوتی ہے۔ اور زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے نوازا جاتا ہے۔ چمنِ رشد و ہدایت کے اس گلِ سرسبد (علیہ التحیۃ والسلام) کی نمود درحقیقت عالمِ انسانیت کے لئے بہارِ تازہ کی نوید جانفزا اور حیاتِ نو کی نشید دل نواز تھی جس کی حسین و شاداب یاد سے اپنے قلب و دماغ کو جنت بداماں بنانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اسکی محفل میں بیٹھ کر دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے

رفیقانِ محترم! امسال اس تقریبِ سعید پر میرے خطاب کا موضوع قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی توضیح و تشریح ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (۹/۳۳)

یعنی خدا کی ذات وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت، یعنی وہ نظامِ زندگی دے کر بھیجا جس نے انسانوں کے وضع کردہ تمام نظاماتِ حیات پر غالب آکر رہنا ہے خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خدائے واحد کے مبنی برحقیقت نظام کو خالصۃً قبول و اختیار کرنے کے بجائے، مختلف نظاموں میں پیوند سازی

سے حق اور باطل میں مفاہمت کے خواہاں ہوں

دین سے مراد

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے، قرآنی اصطلاح میں دین سے مراد نظامِ زندگی یا ضابطۂ قوانین ہوتا ہے یعنی وہ روش، وہ طریق، وہ انداز، وہ مسلک، وہ ضابطہ جس کے مطابق انسان اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس آیۂ عظیمہ میں یہ انقلاب آفریں اعلان کیا گیا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ انسانی ہئیتِ اجتماعیہ سے متعلق جو نظامِ زندگی لے کر مبعوث ہوئے ہیں وہ انسانوں کے خود ساختہ تمام نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہیگا۔ اور چونکہ حضور نبیؐ آخر الزمان کی رسالت، مکان و زمان کی حدود سے ماوراء ہے ---- یعنی یہ عالمگیر انسانیت کو محیط ہے اور اسے قیامت تک جاری و ساری رہنا ہے ---- اس لئے، اس، اسقدر جرأت طلب، تحیر انگیز، انقلاب آفریں، حشر بداماں، دعویٰ سے مراد یہ ہے کہ جتنے نظامہائے حیات، نبی اکرمؐ کے زمانے میں موجود تھے، اور جس قدر نظامہائے زندگی بعد میں وضع یا نافذ ہونگے، وہ سب ناکام و نامراد رہیں گے، اور انسانی مشکلات کے حل کے لئے وہی نظامِ حیات کامیاب و کامران ثابت ہوگا، جو اس پیامبر انقلابؐ کی وساطت سے دنیا کو دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جب ہم "نظامِ حیات" کہیں گے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ وہ نظام انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور جب ہم یہ کہیں گے کہ جو نظام، نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو دیا گیا وہ انسانوں کے وضع کردہ تمام نظامہائے حیات پر غالب آیا اور غالب آئے گا، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم، دنیا کے مختلف نظامہائے زندگی کا تقابل، قرآن کریم کے پیش کردہ نظامِ زندگی (دین الحق) سے کریں اور پھر تاریخی شواہد سے بتائیں کہ وہ نظام کس طرح ناکام رہے اور یہ نظام کیسے کامیاب ثابت ہوا۔ اور اس طرح ہم دنیا کو واضح کریں کہ اس نظام میں اب بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ، انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے زندگی پر غالب آجائے۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع بڑا جامع اور طویل، فلہذا فرصت طلب ہے۔ اسلئے یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ میں ایک نشست میں اسکے متنوع گوشوں کو سامنے لاسکوں (اس کے متعلق میں اپنی کتابوں میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس وقت میں اسکے صرف ایک گوشے کو نمایاں طور پر پیش کرونگا۔ یعنی اس گوشے کو جسے تاریخ انسانیت میں ہمیشہ اہمیت رہی ہے اور آج بھی وہ بڑی نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ (وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔)

قریش کیطرف سے مخالفت

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، اور قرآن کریم کے اوراق اس پر شاہد کہ نبی اکرمؐ نے جو پیغام پیش کیا، قریش کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی ---- ایسی سخت مخالفت کہ جب یہ کمزور و ناتواں سی جماعت، تیرہ سال تک مکہ میں ان کے مظالم برداشت کرنے کے بعد وہاں سے تین سو میل دور مدینہ کی طرف ہجرت کر کے چلی گئی تو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔

ایک لشکر جرار لے کر ان پر چڑھ دوڑے۔ اور یہی نہیں کہ ایک آدھ حملہ اور شکست کے بعد اس مخالفت سے باز آ گئے ہوں، ہر شکست کے بعد مزید قوت فراہم کر کے بار بار نبرد آزما ہوتے رہے۔ اور جب تک فتح مکہ کے بعد تھک کر چور نہیں ہو گئے، یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قریش کی اس مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ آج تو ہم اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ اسلام نام ہے خدا کی پرستش کا۔ لیکن اگر اسلام یہی تھا تو اس میں کون سی ایسی بات تھی جس کی قریش کی طرف سے اسقدر شدید اور زندگی کے آخری سانس تک مخالفت کی جاتی؟ اسی عرب میں جہاں سے یہ آواز اٹھی تھی، انہی قریش کے گرد و پیش یہود موجود تھے۔ عیسائی موجود تھے۔ مجوسی موجود تھے۔ حتیٰ کہ وہاں حنیف کا گروہ بھی موجود تھا جو ایک خدا کے ماننے والے اور اسی کی پرستش کرنے کے مدعی تھے۔ یہ سب اپنے اپنے طریق پر خدا کو مانتے اور اس کی پرستش کرتے تھے۔ قریش نے ان میں سے کسی کی مخالفت نہ کی۔ ان کے راستے میں کبھی مزاحم نہ ہوئے۔ پھر کیا تھا کہ وہ اس نئے پیغام کی مخالفت میں شعلۂ جوالہ کی طرح دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اس کی مخالفت میں اپنی جان اور مال تک کی بازی لگا دی، درآنحالیکہ اس پیغام کے ماننے والوں کا مسلک یہ تھا کہ قریش کے معبودوں کو برا بھلا تک نہ کہا جائے اور دین کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔ قریش کی روش کے اس فرق کو سمجھنے کے لئے مذہب اور دین کے بنیادی فرق کا سمجھنا ضروری ہے۔

مذہب اور دین کا فرق

یہود، نصاریٰ، مجوسی، حنیف وغیرہ مذہب پرست تھے۔ اس لئے ان کے عقاید یا پوجا پاٹ سے قریش کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ لیکن یہ نیا پیغام مذہب کا مدعی نہیں بلکہ دین کا علمبردار تھا جس کا ٹکراؤ ان کے نہج زندگی، طریق حیات اور مفاد پرستیوں سے ہوتا تھا اس لئے وہ اس کی ترویج اور فروغ میں اپنے لئے مہیب خطرہ پاتے تھے۔ دین اور مذہب میں کیا فرق ہوتا ہے، اسے قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں خود واضح کیا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ ان کا مقصد اقامت صلوٰۃ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ کرتے ہیں تم اپنے طریق پر نماز پڑھ لیا کرو۔ لیکن جب یہ صلوٰۃ قائم ہونے لگی تو انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ شعیبؑ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ ..... اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ (۱۱/۸۷) یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال و دولت کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں؟ یہ ہے فرق مذہب کی نماز اور دین کی صلوٰۃ میں۔ قوم ثمود میں حضرت صالحؑ پیدا ہوئے۔ بڑے ہونہار، دانشمند، اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک۔ انہوں نے جب دین کا پیغام دینا شروع کیا تو قوم نے غم اور غصے کے ملے جلے جذبات سے کہا کہ يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا۔ (۱۱/۶۲) تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تم نے کیا کہنا شروع کر دیا؟ جب حضرت صالحؑ اس پر بھی

اپنے پیغام کی نشرواشاعت سے باز نہ آئے تو انہوں نے ان کی سخت مخالفت شروع کر دی، حتیٰ کہ ان کی جان تک کے لاگو ہو گئے۔ یہ مخالفت کیوں تھی؟ اس لئے کہ حضرت صالحؑ دین کی تبلیغ کرتے تھے — اور یہ دین کیا تھا، اسے غور سے سنئیے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی کی تھی۔ لوگ مویشی پالتے تھے اور ظاہر ہے کہ مویشیوں کی پرورش کا ذریعہ چراگاہیں اور پانی کے چشمے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ زورآور افراد، زمین کی حدبندی کر کے چراگاہوں اور چشموں کو اپنی ملکیت میں لے لیتے تھے اور غریبوں اور کمزوروں کو اس کی اجازت نہیں ہوتی تھی کہ اُن کے مویشی اِن چراگاہوں میں چریں پھریں۔ حضرت صالحؑ نے ان کی اس روش کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ اس کے لئے تمہارے پاس کیا وجہ جواز ہے کہ تم خدا کی زمین کو جسے اس نے اپنی مخلوق کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے، ذاتی ملکیت بنا بیٹھتے ہو۔ صحیح نظامِ حیات یہ ہے کہ ارض اللہ (خدا کی زمین) کو ناقۃ اللہ (خدا کی پیدا کردہ مخلوق) کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (۱۱/۶۴ ؛ ۷/۷۳) یہ تھا وہ دین جس کی مخالفت مفاد پرست گروہوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ مفاد پرست گروہ میں جاگیردار، سرمایہ دار اور مذہبی پیشوا سب شامل ہوتے ہیں۔

قریش کی مفاد پرستیاں

دین اور مفاد پرستی کی اس کشمکش میں آپ قریش کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ نبی اکرمؐ کے پیش کردہ پیغام کے خلاف ان کی شدت کی علت سمجھ میں آجائے گی۔ کعبہ سارے عرب میں مذہب پرستی کا مرکز تھا۔ اور قریش کعبہ کے متولی (پروہت) تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے دور کے کتنے بڑے پاپان تھے۔ دولت کے علاوہ، ان کی عزت، سیادت، تعظیم و تکریم اور حشمت و وقار کا راز اسی برہمنیت میں مضمر تھا۔ اسی سے سارے عرب میں اُن کی چودھراہٹ قائم تھی۔ اس کے بعد ان کی معاشی سرفرازی کا مدار تجارت پر تھا۔ ان کے بڑے بڑے قافلے سال بھر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر سرگرمِ سفر رہتے تھے۔ اور چونکہ یہ کعبہ کے متولی تھے اس لئے اُن صحراؤں اور بیابانوں میں بھی جہاں کسی کی کوئی متاع محفوظ نہیں ہوتی تھی، ان کے قافلوں کو رہزنوں اور قزاقوں کا کوئی خوف و خطر نہیں ہوتا تھا — قرآن کی شہادت کے مطابق — اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶/۲) ان کے قافلے سردی گرمی، ہر موسم میں، بے خوف و خطر، رواں دواں مصروفِ سفر رہتے تھے۔ اور اس طرح اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۴)۔ انہیں نہ تنگدستی کا خطرہ تھا نہ لوٹ مار کا خوف۔

پروہتوں (برہمنوں) کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ذات پات کے بندھنوں کو سختی سے سخت کرتے رہیں تاکہ پیشوائیت پر انہی کی اجارہ داری رہے۔ ان کے حلقہ سے باہر کسی کے دل میں پروہت

بٹنے کا خیال تک نہ آنے پائے۔ اس بنا پر قریش حسب و نسب کے بندھنوں کو سخت مضبوط رکھتے تھے۔ ان کے نسبی تفاخر کی علم یہی تھی۔

یہ تھا قریش کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا نقشہ اُس زمانے میں جب اس دینِ الحق کے داعی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے اپنی آواز بلند کی۔ یہ آواز کیا تھی؟ یہ نعرۂ انقلاب تھا مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں، سرمایہ داری کی خون آشامیوں اور نسبی تفاخر کی انسانیت سوز گروہ بندیوں کے خلاف۔ یہ ان سب کے لئے پیغامِ موت تھا۔ یہ ایک برقِ خاطف تھی جو قریش کے تقدس، دولت اور نسبی تفاخر کے خرمن پر گر کر اسے راکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اسلام کوئی مذہب نہیں جو پوجا پاٹ کا جدا گانہ طریق وضع کرنے کے لئے آیا تھا۔ یہ دین تھا جو قریش کے نظامِ حیات کے ان تینوں گوشوں کی بساط لپٹنے کے لئے ظہور میں آیا تھا۔ یہ دینِ باطل کے ساتھ دینِ الحق کا ٹکراؤ تھا۔

وارننگ

اس دینِ الحق نے مذہبی پیشواؤں کے متعلق اعلان کیا کہ اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ - (۹/۳۴)۔ ان مذہبی پیشواؤں اور روحانی مقتداؤں کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ یہ کسی قسم کا کوئی تعمیری کام کئے بغیر دوسروں کی کمائی ناحق کھا جاتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کا راستہ دکھاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑے سنگِ گراں یہی ہیں۔ یہ لوگوں کو خدا کی طرف چلنے سے روکتے ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ مذہب کی ابلہ فریب چیستانوں میں اُلجھے رہیں اور خدا کا نظام قائم نہ ہونے پائے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے سرمایہ داروں کے متعلق کہا کہ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ — یہ لوگ جو سونے اور چاندی کے سکوں کے انبار در انبار جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے (کہ جو خدا کی تجویز کردہ راہ ہے) کھلا نہیں رکھتے — فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹/۳۴)۔ اے پیغامبرِ انقلاب! ان سے برملا کہہ دو کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ ایک الم انگیز تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا — اب وہ دینِ الحق — وہ مبنی بر حقیقت نظامِ زندگی — آگیا ہے جو باطل کی ہر روش کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا - (۲۱/۱۸)۔ قریش جو اپنی دولت کی افراط اور جتھے کی کثرت کے نشے میں بدمست تھے، اس وعید سے کس طرح مرعوب ہو جاتے؟ انہوں نے انتہائی حقارت آمیز انداز سے کہا کہ نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ (۳۴/۳۵) — ہم اس قدر کثیر دولت کے مالک اور اپنے طاقتور قبیلے کے افراد ہیں۔ ہمیں کون تباہ کر سکتا ہے؟

جواب میں کہا گیا کہ ــــ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ وَمَا کَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۔ وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ۔ اِنَّهٗ کَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا ۔ (۳۵/۴۴) کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیا کہ ان سے پہلے جن قوموں نے اس قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا، حالانکہ وہ قوت و اقتدار میں ان سے کہیں بڑھ کر تھے۔ (ان سے کہو کہ) خدا ایسا کمزور نہیں کہ کائنات کی کوئی قوت بھی اُسے مغلوب کر سکے۔ اس کا نظام علم و بصیرت اور قاعدے اور قانون پر مبنی ہے کسی کی دھاندلی اُسے شکست نہیں دے سکتی۔ ان سے کہا گیا کہ تمہیں کعبہ کے متولی ہونے پر بڑا ناز ہے ــ اور اس باب میں ابولہب تمہارا مرغنہ ہے۔ سو دل کے کانوں سے سن رکھو کہ تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۔ فطرت کے پروگرام کے مطابق ابولہب بے دست و پا ہو چکا ہے۔ اس کی برہمنیت اب چند دنوں کی مہمان ہے ــ مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا کَسَبَ ۔ (۱۱۱/۲) اس کا مال و دولت اور کسب و ہنر (PRIESTCRAFT) اسے اس تباہی سے نہیں بچا سکیگا۔ اس قسم کی پے در پے وعید سے وہ ذرا (SERIOUS) ہو گئے۔ اور آپؐ سے کہا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا واقعی ایسا ہو جائے گا یا تم ہم سے یونہی مذاق کرتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا کہ مذاق کیسا؟ کیا میں نے تم سے کبھی مذاق کیا ہے یا کوئی غلط بات کہی ہے جو اس اہم معاملہ میں تم سے مذاق کرونگا یا جھوٹی دھمکیاں دونگا؟ ــ اِیْ وَ رَبِّیْ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۔ وَ مَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ۔ (۱۰/۵۳) ــ میرا خدا اس پر شاہد ہے کہ یہ سچ ہے۔ یہ حق ہے۔ ایسا ہو کر رہیگا اور ضرور ہو کر رہیگا۔ تمہارا مقابلہ خدا کے ساتھ ہے اور تم خدا کو ہرا نہیں سکتے۔ تم میری طرف نہ دیکھو۔ میں تو صرف خدا کے نظام کی طرف دعوت دینے والا ہوں۔ اور خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ ۔ (۴۶/۳۲) جو شخص بھی اس داعی الی اللہ کی دعوت قبول نہیں کریگا وہ تباہ ہو کر رہے گا۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے بچا نہیں سکیگی۔ یہ تمہارا مال و دولت جس کے بل بوتے پر تم اس نظام حق و صداقت کی مخالفت کر رہے ہو تمہارے کسی کام نہیں آسکیگا۔ یہ میرا فیصلہ نہیں۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ وہ نظام تباہ ہو کر رہتا ہے جس میں قوم کی ذہنیت یہ ہو جائے کہ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۔ (۱۰۴/۲) مقصد زندگی دولت جمع کرنا اور اسے بڑھاتے چلے جانا ہے۔ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ ۔ ایسے نظام کے علمبردار اس خیال خام میں مدہوش رہتے ہیں کہ ان کی دولت، ان کا سرمایہ انہیں بقائے دوام عطا کر دیگا ــ کَلَّا ۔ بالکل نہیں۔ ایسا ہرگز

نہیں ہوگا۔ لَیُنۡبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ۔ (۱۰۴/۴) یہ خود اوران کا سرمایہ تباہی کے اس جہنم میں پھینک دیا جائے گا جو انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دے گا۔

قریش کو یہ وارننگ (انذار) اس زمانے میں دی جارہی تھی جب ان کی شوکت وحشمت نقطۂ عروج پر تھی۔ اور وارننگ دی جارہی تھی ان کی طرف سے جو نہایت کمزور و ناتواں، انتہائی بے سروسامان، اور بے حد مظلوم و مقہور تھے۔ لہٰذا، دنیا کے کسی پیمانے اور اندازے کے مطابق بھی ایسا باور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بھی برپا ہوسکتا ہے۔ لیکن انقلاب میں ٹکراؤ، نظریاتِ حیات

تصادم نظریات میں ہوتا ہے

(IDEOLOGIES) میں ہوتا ہے جس آئیڈیالوجی میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہ ہو، اس پر مبنی نظام تباہ ہوکر رہتا ہے خواہ اس نے اپنی حفاظت و بقا کے لئے کتنا ہی ساز و سامان اکٹھا کیوں نہ کر رکھا ہو۔ اقبالؒ کے الفاظ میں،

تدبّر کی فسوں کاری سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بِنا سرمایہ داری ہو

لہٰذا اس داعیٔ انقلاب (علیہ التحیۃ والسلام) کی یہ تحدّی۔ یہ چیلنج، اپنے نظام کی بنیادوں کی محکمیت پر تھا، ساز و سامان کی فراوانی اور دولت وقوت کی اکثریت پر نہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو سطح بین نگاہوں کو دکھائی نہیں دیا کرتی۔ لیکن قریش میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اس کا اندازہ کرلیا تھا کہ جس نظام کی دعوت عام کی جارہی ہے اس میں بنیادی طور پر (INTRINSICALLY) ایسی صلاحیت ہے کہ اگر اسے ذرا سی بھی سازگار فضا مل گئی تو یہ مخالفت کی ہر قوت کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ اس خطرہ سے قریش کے اربابِ حل وعقد کس درجہ خائف تھے، اس کا نقشہ

نوحۂ ابوجہل

اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں، جاوید نامہ، میں کھینچا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان آنے والے خدشات سے گھبرا کر ابوجہل حریمِ کعبہ میں گیا، اور اس کا دامن تھام کر، اپنے معبودوں کے حضور یوں مصروفِ آہ و فغاں ہوا۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ | از دمِ او کعبہ را گُل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود | نوجواناں را ز دستِ ما ربود

ساحر و اندر کلامش ساحری است
ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است

اس تمہید کے بعد اس نے بتایا کہ اس داعیؐ کا پیغام ہے کیا؟ اے عزیزانِ من! ذرا غور سے سنئیے کہ اقبالؒ نے اس انوکھے انداز سے ابوجہل کی زبان سے وہ کچھ کہلوایا ہے جو اسلامی تعلیم کا مقصود و مطلوب اور اسکے نظام کی غرض و غایت ہے۔ ابوجہل نے کہا کہ

مذہب او قاطع ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

اسکے بعد ابوجہل نے دو لفظوں میں وہ بات کہہ دی جس کی تفصیل سینکڑوں صفحات میں بھی نہ سما سکے۔ اس نے کہا کہ

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

فطرت کا پروگرام

یہ نکتہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں ایک جگہ کہا ہے کہ "حیات عالم وجدانی طور پر اپنی ضروریات کا مشاہدہ کر لیتی ہے اور نازک مواقع پر اپنا راستہ آپ متعین کر لیتی ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے جسے ہم مذہب کی زبان میں نبوت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔" (چوتھا خطبہ صفحہ ۱۲۱) میں اقبالؒ کے اس فکری مطالعہ کی فلسفیانہ گہرائیوں میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اسکے عملی مظاہرہ کو سامنے لانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے "تمام انبیاء کرامؑ شروع سے آخر تک ایک ہی دین کے پیامبر تھے۔ جس کی اصل و غایت یہ تھی کہ لا الٰہ الا اللہ۔ یعنی

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

لیکن قرآن نے ہر نبی کی تعلیم کے کسی نہ کسی خاص گوشے کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے۔ اس گوشے کا تعلق اُس معاشرتی خرابی سے تھا جو اس نبی کے زمانے میں شدت اختیار کر گئی تھی اور جس کی اصلاح کی ضرورت سب سے پہلے تھی۔ اس کا نام، ہماری اصطلاح میں، زمانے کا تقاضا ہے۔ یعنی جس نبی کے عہد میں زمانے کا جو تقاضا سب سے زیادہ شدید ہوتا تھا، وہ اس کا بالخصوص مرکزِ توجہ بن جاتا تھا اور اسی کا ذکر قرآن

نمایاں طور پر کرتا ہے۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں، طبقاتی امتیاز ایسی شدت اختیار کر گیا تھا کہ امراء اور روسا کا طبقہ، محنت کشوں اور مزدوروں کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھنا تک گوارا نہیں کرتا تھا۔ وہ انہیں 'نیچ، کمینہ اور رذیل' سمجھ کر نہایت حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ حضرت نوحؑ نے ان کی اس ننگِ انسانیت ذہنیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان سے کہا کہ یاد رکھو ـــ اصلِ تہذیب احترامِ آدم است ـــ قومِ ثمود میں 'جاگیرداری' (FEUDALISM) اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ حضرت صالحؑ نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اُن سے کہا کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دِہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر، اُو را مگیر

حضرت شعیبؑ کے زمانے میں تاجرانہ ذہنیت کے سرمایہ نے اہلِ مدین کو پاگل بنا رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ کسی محنت کش کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جاتا تھا، نہ خریدار کو اس کی ادا کردہ قیمت کے عوض صحیح شے ملتی تھی۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی اس روشِ خون آشامی کو چیلنج کیا اور انتہائی کشمکش کے بعد، اس نظام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ صاحبِ ضربِ کلیمی حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں ملوکیت کا پارہ فرعونی درجہ تک چڑھ چکا تھا۔ آپ نے اس آگ کو بحیرہ قلزم میں ڈبو کر ٹھنڈا کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں، یہودیوں کی روشِ سود خوری اور ہیکل کے احبار و رہبان کی دسیسہ کاری' ذلیل ترین حد تک پہنچ چکی تھی۔ آپؑ نے ان کے خلاف نعرۂ انقلاب بلند کیا۔ حضور نبی اکرمؐ کے زمانے میں یہ تمام خرابیاں جو پہلے خاص خاص مقامات میں ایک ایک، دو دو کر کے اُبھرتی تھیں، عالمگیر وبائی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ یعنی قرآن کے الفاظ میں ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد رونما ہو چکا تھا۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، جاگیرداری، زمینداری۔ سرمایہ پرستی، وطن اور نسل پرستی، غلامی، تذلیلِ عورت وغیرہ خرابیاں انتہائی شدت اختیار کر چکی تھیں۔ اس لئے نبوتِ محمدیہ کی غایت بھی ایک عالمگیر انقلاب تھا۔ اسی کا نام اتمامِ نعمت اور تکمیلِ دین تھا۔ لیکن اس ہمہ گیر فساد کے بھی بعض گوشے ایسے تھے جو مقابلتہً زیادہ اُبھرے ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس باب میں اپنی کتاب تفہیماتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں:-

معاشی گوشہ

چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں دنیا توحید کو فراموش کر چکی تھی اس لئے اُس زمانے

ہیں توحید کی اشاعت اور طہارت ، صلوٰۃ ، زکوٰۃ ، حج ، روزہ اور ذکر کی عبادتیں جاری کرنے کے احکام نازل ہوئے ۔ مگر چونکہ ہمارے نبی اکرمؐ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی و معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضورؐ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا ۔ اور آپؐ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کرایا (جو ان ناہمواریوں کا سرچشمہ تھیں ۔) (جلد اول ، صفحہ ۱۲۶)

مزدکیت

یہ معاشی ناہمواریوں کی شدت تھی جس کے ردعمل کے طور پر ایران میں مزدکیت کی تحریک نے جنم لیا ۔۔۔ اس تحریک کو اُس دور کی کمیونزم سمجھنا چاہیے ۔ لیکن اس سے اُن ناہمواریوں کا علاج نہ ہو سکا ۔ انسانوں کی وضع کردہ تحریکوں میں نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ انتہائی شدت تک پہنچی ہوئی خرابی کا سدباب انتہائی حربوں سے کرنا چاہتی ہیں ۔ اس طریق کا رتیب انتہائی جذبات کا تصادم انتہائی جذبات سے ہوتا ہے ۔ لیکن لوہے اور پتھر کے اس ٹکراؤ سے چنگاریاں تو ابھر سکتی ہیں' نہ لوہا موم ہو سکتا ہے' نہ پتھر کوئی دوسرا قالب اختیار کر سکتا ہے ۔ ان خرابیوں کا علاج خدا کی تجویز کردہ تدبیر کی رو سے ہی ہو سکتا ہے جس کی بنیاد ابدی حقائق پر ہوتی ہے سطحی جذبات پر نہیں ۔ وہ خارجی خرابیوں کی اصلاح' قلب و نگاہ کی داخلی تبدیلی سے کرتا ہے ۔ وہ محسوس ناہمواریوں ہی کو دور نہیں کرتا بلکہ ان محرکات کو ختم کرتا ہے جو ان ناہمواریوں کی علت ہوتے ہیں ۔ چنانچہ عین اس وقت جب مزدکیت ناکام ہو رہی تھی' انقلاب محمدیہ کا ظہور ہوا اور اس نے ملوکیت اور نظام سرمایہ داری' دونوں کا خاتمہ کر کے' ایک انسانیت ساز' نظام صالح کی تشکیل کر دی ۔ اس انقلاب کی ابتداء مقامی طور پر' سرزمین حجاز سے ہوئی اور جب یہ شجر طیب اس خطہ میں زمین گیر ہو گیا تو پھر اس کا دائرہ وسیع کیا گیا ۔ اس مقصد کے لئے حضورؐ نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو دعوت نامے بھیجے ۔ کہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے' یہی دو تہذیبیں اُس زمانے میں فساد آدمیت کا سرچشمہ تھیں ۔ آپؐ نے

قیصر و کسریٰ کے نام

انہیں جو مکتوب گرامی ارسال فرمائے' وہ اپنے ایجاز اور جامعیت کے لحاظ سے عدیم النظیر ہیں ۔ ان میں چند الفاظ میں' نہایت خوبصورت انداز سے ساری بات کہہ دی گئی ہے ۔ ہرقل کے نام خط میں' اسلام کی دعوت کے بعد لکھا تھا کہ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْيَرِيْسِيِّيْنَ ۔ اگر تم نے سرکشی اختیار کی تو تیری مملکت میں جو کاشتکار تباہ ہو رہے ہیں' ان کی مظلومیت کا وبال تیری گردن پر ہو گا ۔ اور کسریٰ سے کہا تھا کہ فَاِنْ اَبَيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ ۔ اگر تم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا تو تیری ساری رعایا ۔۔۔ مجوس ۔۔۔ کے جرائم کا بوجھ

تیرے سر پر ہوگا۔ اس دعوت نامہ کے ملنے پر ہرقل نے ابوسفیان کو بلا کر، جو اس وقت اتفاق سے وہاں تھا، اسلامی تعلیمات اور رسولِ اکرمؐ کے کوائفِ حیات کے متعلق دریافت کیا اور اس کے بعد کہا کہ اِنْ يَّكُ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَاِنَّهٗ نَبِيٌّ ۔ وَ لَيَبْلُغَنَّ مُلْكُهٗ مَا تَحْتَ قَدَمَيَّ ۔ جو کچھ تم کہتے ہو، اگر وہ سچ ہے تو یہ شخص نبی ہے اور اس کی سلطنت یقیناً اس سرزمین تک پہنچے گی جو اس وقت میرے زیرِ نگین ہے۔ اس انقلابی تحریک کا مطالعہ کرنے کے بعد ہرقل کی مدبرانہ نگاہ اس حقیقت کو بھانپ گئی تھی کہ اس میں بڑھنے، پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہے اور جب اس کا عملی نظام کسی ایک خطہ میں بھی متشکل ہوگیا تو اس کے انسانیت ساز، منفعت بخش نتائج کی کشش سے لوگ، دور دور سے اس کی طرف کھنچے چلے آئیں گے اور کوئی مملکت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اگرچہ حکومت کی مصلحتیں، یا شاید پندارِ نفس ان کی راہ میں حائل ہوگیا۔ اور نہ قیصر نے اس دعوت کو قبول کیا اور نہ کسریٰ نے۔ لیکن تاریخ نے اس حقیقت کی شہادت دی کہ ہرقل صحیح نتیجہ پر پہنچا تھا۔ حضورؐ کے متبعینؓ کے ہاتھوں اس انقلاب نے ایران اور روم کی سرزمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور مظلوم انسانیت نے باطل کے مستبد نظاموں کے پنجۂ خونیں سے نجات حاصل کر کے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اقوامِ عالم نے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کے عظیم دعویٰ کی صداقت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر لیا۔ اس نظام کی حدود کے اندر ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، جاگیرداری، سرمایہ داری، غلامی، نسل پرستی، وطن پرستی، رنگ اور زبان کی بنا پر تفاخر، عورت پر حاکمیت، غرضیکہ فسادِ آدمیت کے ہر گوشے کی بساط الٹ گئی اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی۔

اس کے بعد

لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس حریت آموز تعلیم اور انقلاب آفریں تربیت میں ۔۔۔ جو اس نظام کی اساس تھی ۔۔۔ کمی آنی شروع ہوگئی اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ نظام مضمحل ہونے لگا۔ جس قدر اس میں کمزوری آتی گئی اسی نسبت سے مفاد پرست قوتیں سر ابھارتی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ زمانے کی ریگِ رواں پر اس نظام کے صرف نقوش باقی رہ گئے اور باطل کا نظام پھر سے اعصابِ عالم پر سوار ہوگیا۔ حضورؐ خدا کے آخری نبی تھے۔ اس لئے باطل کے نظام کو مٹانے کے لئے اب انبیاء نہیں آسکتے تھے اب اس کے لئے دوسرا طریق اختیار کیا گیا۔ حضرات انبیاء کرامؑ کے طریق کو اگر انقلابی کہا جائے تو اس

ارتقائی طریق

جدید طریق کو ارتقائی کہا جائے گا۔ نظامِ خداوندی کا ضابطہ، اپنی مکمل شکل میں قرآن کی دفتین میں محفوظ کر کے رکھ دیا گیا اور کھلے لفظوں میں بتا دیا گیا کہ اس نظام کو آخر الامر قائم ہو کر رہنا ہے کیونکہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس کے سوا کہیں اور نہیں مل

سکتا۔ اگر انسان اسے بطیبِ خاطر اختیار کرلے تو اس سے اس کا وقت بھی بچ جائے گا اور توانائی بھی۔ لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا تو پھر یہ عقل کے تجرباتی طریق (TRIAL AND ERROR) سے اس تک پہنچے گا۔ عقل کے تجرباتی طریق میں ہوتا یہ ہے کہ انسان، اپنے لئے ایک راستہ تجویز کرتا ہے۔ اور اس پر چل پڑتا ہے۔ راستے میں سینکڑوں مشکلات اور ہزاروں دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ ان پر قابو پانے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اس طرح آگ کی خندقیں پھاندتے اور خون کی ندیاں پیرتے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لیکن جب مخالفتوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے راستہ غلط اختیار کیا تھا۔ وہ اپنی منزل سے بہت دور جا پڑا ہے۔ وہ اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اور پہلے تجربہ کا اعادہ پھر سے کرتا ہے۔ پھر وہی آگ کی خندقیں پھاندنا اور خون کی ندیاں پیرنا ہے۔ اس طرح مختلف تجارب کی وادیاں طے کرکے، قرنہا قرن کے بعد، اپنی منزلِ مراد تک پہنچتا ہے اور وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منزل وہی تھی جس کی نشاندہی قرآن نے پہلے دن کر دی تھی۔ اس تگ و تاز، اس سرگردانی و سرگرمی، اس سعی و کاوش، اس صحرانوردی و دشت پیمائی کے لئے اُسے جو جذبہ اُبھارتا ہے، اُسے "زملنے کا تقاضا" کہتے ہیں۔ آپ گزشتہ تیرہ سو سال کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اپنے ہاتھوں سے مسلط کردہ نظام سے تنگ آکر، انسان کس طرح نئے نئے راستوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا اور کس طرح صدیوں کی خون ریزیوں اور آتش فشانیوں کے بعد، اس منزل کے قریب پہنچتا رہا جسے قرآن نے، کاروانِ انسانیت کے لئے چودہ سو سال پہلے متعین کیا تھا۔ آپ دیکھئے۔ کہ وہ کن پُرپیچ و خم راہوں سے گزر کر، ملوکیت کی جگہ نظامِ جمہوریت تک پہنچا ہے جو قرآن کے مشاورتی نظام ہی کا ایک نقشِ ناتمام ہے۔ وہ رنگ و نسل کے امتیازات کے جہنم سے نکل کر، عالمگیر انسانیت کی جنت کی طرف آنے کے لئے کس قدر پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس نے مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے لئے کیا کیا حربے استعمال نہیں کئے۔ اس نے غلامی کے استیصال کے لئے کیا کیا کوششیں نہیں کیں۔ وہ اپنی تگ و تاز کی جولانگاہوں کے بعض گوشوں میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے اور دوسرے گوشوں میں انقلاب لانے کے لئے مصروفِ سعی و کاوش ہے لیکن وہ جن گوشوں میں کامیاب ہوا ہے یا جن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہے، یہ نگاہِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ اس کی سعی و کاوش کا رُخ اسی منزل کی طرف ہے جس کی نشاندہی قرآن نے چودہ سو سال پہلے کر دی تھی۔ بالفاظ دیگر اس کی ہر کوشش کا نتیجہ اور سعی و عمل کا رُخ اس حقیقت کی واضح شہادت ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

عصرِ حاضر کا تقاضا

اب آپ آئیے انسانیت کے اس اہم ترین تقاضا کی طرف جو ہمارے زمانے میں اس شدت سے ابھرا ہے کہ اس کے سامنے دوسرے تقاضے ماند پڑ گئے ہیں۔ یہ تقاضا ہے انسان کی معاشی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کا۔ ہمارے زمانے کو عہدِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کہا جاتا ہے اور بجا طور پر ایسا کہا جاتا ہے۔ اس سے مقصود اس تقاضے کی شدت کا اظہار ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ازمنہ متوسطہ میں جب نظامِ سرمایہ داری کی خباثتیں اپنی انتہا تک پہنچ گئیں تو ایران میں مزدکیت کی تحریک کی نمود ہوئی۔ یہ علامت تھی اس حقیقت کی کہ اب معیشت کے اس انسانیت سوز نظامِ کہن کی بساط الٹنے کا وقت آپہنچا ہے جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا تھا۔ چونکہ یہ تحریک ایک ردِّعمل کے طور پر نمودار ہوئی تھی اس لئے ہر ردِّعمل کی طرح بڑی متشدد تھی۔ اس میں زر اور زمین کے ساتھ زن کے اشتراک کا بھی تصور دیا گیا تھا۔ لیکن اس تحریک کا بنیادی نقص یہ تھا کہ یہ کسی مثبت فلسفۂ حیات پر متفرع نہ تھی۔ اس لئے اس کا سارا پروگرام محض انتقامی اور منفیانہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بجائے کامیاب ہوئی وہ تحریک جو اس کے چند ہی سال بعد ایران کے ہمسایہ ملک عرب سے نمودار ہوئی اور جسے پیامبرِ انقلاب حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا۔ یہ تحریک ایک غیر متبدل فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار تھی جو وحی کی رُو سے عطا ہوا تھا اور لاالٰہ کے ساتھ اِلّا اللہ کا پروگرام بھی اپنے جلو میں لاتی تھی۔ یعنی اس میں یہ صلاحیت تھی کہ یہ باطل کے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ دین الحق کو قائم اور استوار کر دے۔

انقلابِ محمدی

اس تحریک کے داعی اول (علیہ التحیۃ والسلام) نے اپنی دعوت کے اولین ایام میں اپنی جماعت کی تشکیل جن خطوط پر کی اس کی جھلک ہمیں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی اس روایت میں ملتی ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

> اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے ہی فاقے کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر

آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔ (صحیحین)

اس ایک روایت میں اس جدید تحریک کی روح جھلمل جھلمل کرتی سامنے آجاتی ہے۔ یہی وہ روحِ مساوات تھی جو اس کے بعد، اس ارشادِ خداوندی کے مطابق، قرآن کے معاشی انقلاب کی اصل واساس قرار پاگئی جس میں کہا گیا ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اس معاشی نظام میں ایک فرد کس قدر اپنے پاس رکھ سکتا ہے اور اسے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اجتماعی تحویل میں دے دینا چاہیئے۔ فرمایا۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر ایک فرد کی اپنی ضروریات سے زاید ہے، سب کا سب۔ یعنی اس معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مقصدِ ضروریاتِ زندگی پورا کرنا ہے۔ دولت سمیٹ کر رکھنا نہیں۔ اس لئے فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہ سکتی۔ نظامِ سرمایہ داری کا مدار افراد کے پاس فاضلہ دولت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس اصول نے نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اسی اصول کا عملی مظاہرہ تھا جس کی آئینہ دار مسلم کی وہ روایت ہے جس میں حضرت ابوسعیدؓ نے فرمایا کہ

> ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضروریات سے زاید ہو وہ اس آدمی کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زاید کوئی چیز رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

آپؐ نے قریش کے متمولین (سرمایہ داروں) کو وارننگ دی کہ جن غریبوں اور کمزوروں کو تم نے ضروریاتِ زندگی سے محروم کر رکھا ہے، ان کی ضروریاتِ زندگی خود بطیبِ خاطر مہیا کر دو، ورنہ یاد رکھو وہ اگر بھوک سے تنگ آکر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ تمہارے سارے نظامِ تمدن کو تہس نہس کر کے رکھ دینگے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو آپ نے ایک نہایت دلنشیں انداز میں بیان فرمایا جسے ترمذی نے ان الفاظ میں اپنے مجموعہ میں درج کیا ہے کہ (حضورؐ نے فرمایا)

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے

> والوں نے کہا بہت اچھا! ہم نیچے سوراخ کرکے پانی حاصل کرلینگے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس (اقدام) سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کے اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔

قریش کی معیشت زرعی (AGRICULTURAL) نہیں تھی اور صنعت (INDUSTRY) کا وہ دور ہی نہیں تھا۔ اس لئے انہیں دولت کے اکتناز ہی سے روکا گیا۔ اہل مدینہ زراعت پیشہ تھے اور وہاں کے یہودیوں کا پیشہ سود خوری تھا۔ اس لئے وہاں اکتناز دولت کی مخالفت کے علاوہ ربٰو اور زمینداری کے خلاف محاذ قائم کرنا بھی ضروری تھا۔ ربٰو سے مراد ہے سرمایہ کا معاوضہ اور چونکہ دینِ الحق میں معاوضہ محنت کا ہے سرمایہ کا نہیں، اسلئے ربٰو کے متعلق دو ٹوک بات کہہ دی کہ یہ خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ جہاں تک زمین پر انفرادی ملکیت کا تعلق ہے حضرت صالحؑ نے فرمایا تھا کہ ارض اللہ ـــ ناقۃ اللہ کے لئے عام رہنی چاہیئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ

> زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابو داؤد)

قرآن میں پیش کردہ اصول کی اس تفسیر کی رُو سے زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ اور جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہی تو کاشتکاروں کو بٹائی یا ٹھیکہ پر زمین دینے کا تصور ہی باطل قرار پاگیا۔ اسی لئے حضورؐ نے بٹائی یا ٹھیکہ کو ربٰو سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ

> ابن ابی نعیمؒ رافع بن خدیج (انصاری) کا بیان کردہ واقعہ یوں دہراتے ہیں کہ رافع نے ایک زمین پر کاشت کی۔ وہ اس کی آبپاشی کر رہے تھے کہ حضورؐ ادھر سے گزرے اور پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے اور یہ زمین کس کی ہے۔ رافع نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا (جس کی یہ زمین ہے) حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ لہٰذا زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کرلو۔

(شاہ ولی اللہ۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۶۸ء صفحہ ۵۸)

اس فیصلہ کی روشنی میں نسائی میں یہ تصریح بھی آئی ہے کہ

> رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی نہیں

سے سکتا۔ فرمایا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی، بھوسہ تو لے سکتا ہے؟ فرمایا:
بالکل نہیں۔

حضورؐ نے زرعی انقلاب کی اس طرح ابتدا کی اور اس کی تکمیل حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس وقت ہوئی جب آپ نے عراق کی مفتوحہ زمینوں کو افراد میں تقسیم کرنے کے بجائے، مملکت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا، تاکہ وہ تمام (اس وقت کے) موجودہ اور آنے والی نسلوں کے افراد کے لئے سامانِ رزق مہیا کریں۔

آپ نے جس مملکت کی بنیاد رکھی، اس کی معاشی ذمہ داری کو، ان مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں متعین کر دیا کہ

> جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ تعالےٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام مالکؒ)

معاشیات میں سب سے اہم سوال، کام کی اجرت کے تعین کا ہے۔ یہ سوال اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہے کہ اس کا اطمینان بخش حل اِس وقت تک نہیں مل سکا لیکن قرآن کے معاشی نظام کے علمبرداران 'محمد رسول اللہ والذین معہ' نے اس کا وہ حل پیش کیا جو اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی نظام میں افراد مملکت کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے عہد رسالتمآبؐ میں اس پروگرام کی ابتدا اس طرح کر دی گئی کہ مملکت کی طرف سے افراد کے وظیفے مقرر کر دیئے جائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں جب یہ سلسلہ آگے بڑھا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ وظائف کس معیار کے مطابق مقرر کئے جائیں۔ بعض حضرات نے تجویز کیا کہ جن لوگوں نے جس قدر زیادہ کام کئے ہیں انہیں اسی نسبت سے زیادہ وظیفہ دیا جائے۔ آپ نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اجرتوں کے تعین سے متعلق اس اصول کی بنیاد ہے۔ جسے میں نے اس باب میں حرفِ آخر قرار دیا ہے۔ آپ نے کہا کہ

> جن حضرات کی خدمات آپ گن رہے ہیں، انہیں ان کا اجر خدا کے ہاں سے ملے گا۔ ہم معاش کی تقسیم کر رہے ہیں اور یہ تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ (کتاب الخراج۔ قاضی ابو یوسف)

یعنی دنیا کے اس عظیم ترین پیامبر انقلابؐ کی تعلیم کی رو سے، اصول یہ قرار پایا کہ

> ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق کام کرے، اور اسے اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے[1]

[1] صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو۔

اس نظام کی معاشی جزئیات' مزدکیت سے اس قدر مماثل تھیں کہ ابوجہل کی نگاہ ہیں اس سے دھوکا کھا گئیں اور اس نے سمجھا کہ سلمان پارسیؓ' ایران سے مزدکیت کی تعلیم حاصل کرکے آیا ہے اور اسی کو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تھا اس کی نگاہ کا وہ دھوکا جس کی رُو سے اس نے کہا تھا کہ

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

بہرحال یہ تھا وہ نظام جسے حضورؐ نے متشکل فرمایا اور سب سے پہلے اپنی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالا۔ حضورؐ نے نہ کوئی جائیداد کھڑی کی' نہ فاضلہ دولت کا ایک پیسہ بھی گھر میں رکھا۔ اپنی ضروریات کے لئے کم از کم لیا' اور ورثہ میں ایک کوڑی بھی نہ چھوڑی۔ یہی تھی حضورؐ کی وہ سیرت طیبہ جس کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (۳۳/۲۱) تمہارے لئے رسول کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ اس کے بعد جب یہ نظام ختم ہوا تو حضورؐ کی سیرت اقدس کا یہ نقشہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا۔ اب اتباعِ سنت نام رہ گیا بے حد و نہایت دولت جمع کرنے اور جائیدادیں کھڑی کرنے' اور نشست و برخاست کے ایک خاص انداز اور تراش و خراش کی ایک خاص وضع قطع اختیار کرنے کا اور بس۔

روس کا انقلاب

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے' تیرہ سو سال کے بعد' زمانے نے پھر کروٹ لی ہے۔ اس دور میں معاشیات نے پھر سے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں' مغرب کے نظام سرمایہ داری نے وہی شدت اختیار کر

لہ (حاشیہ صفحہ گزشتہ) مارکس کے معاشی نظام کی انتہائی متشکل کو کمیونزم کہا جاتا ہے اور عبوری دور میں یہ سوشلزم کے پیکر میں متشکل ہوتی ہے۔ سوشلزم میں اصول یہ کارفرما ہوتا ہے کہ "ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جاوے اور اس کے کام کا معاوضہ دیا جائے۔" (اس معاوضہ کا معیار کیا ہو' اس کا تعین کسی نے نہیں کیا) اور کمیونزم کا اصول یہ ہے کہ "ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق کام کرے اور اسے اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔" آپ غور فرمایئے کہ کیا یہ وہی اصول نہیں جس کا اعلان حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا تھا۔ ہمیں اس پر فخر ہونا چاہیئے کہ چودہ سو سال کے ناکام تجارب کے بعد بالآخر انسانی فکر اسی نتیجہ پر پہنچا جس کا اعلان' انقلاب محمدی نے ایسے واضح الفاظ میں کیا تھا۔

لی جو شدت اس نے چھٹی صدی عیسوی میں اختیار کی تھی اور جس طرح اُس کا ردِعمل تحریکِ مزدکیت کی شکل میں نمودار ہوا تھا، اسی کا ردِعمل روس کی کمیونزم کی صورت میں ۱۹۱۷ء میں ظہور میں آیا۔ لیکن جس طرح مزدکیت کسی محکم نظامِ حیات پر استوار نہیں تھی بلکہ ایک ہنگامی ردِعمل تھا اسی طرح کمیونزم کا محرک بھی محض انتقامی جذبہ تھا۔ کسی نے اس تحریک (کمیونزم) کا استقبال کسی طرح کیا، کسی نے کسی طرح، لیکن جن کی نگاہوں کے سامنے قرآن کے حقائق، حضور نبی اکرمؐ کا انقلابی پروگرام اور تاریخی شواہد تھے، اس نے اُسی زمانے میں بھانپ لیا کہ جس طرح مزدکیت اُس زمانے کے تقاضوں کی پیداوار تھی اور ایک صحیح معاشی انقلاب کا طائرِ پیش رس، جو چند ہی سال بعد سرزمینِ حجاز سے اُبھرا، اسی طرح کمیونزم بھی عصرِ حاضر کے تقاضوں کی تخلیق ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ وہ زمانہ قریب آرہا ہے جب پھر سے قرآن کے معاشی انقلاب کا ظہور ہوگا۔ آپ دیکھئے کہ اس دیدہ ور کی مومنانہ فراست نے کیا سمجھا اور اُسے کس طرح سمجھایا تھا۔ اقبالؒ نے ۱۹۳۶ء میں کہا تھا کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے وجہ نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور	فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر	کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں	اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار
(ضربِ کلیم)

لیکن اقبالؒ نے یہ نہیں کہا تھا کہ "حرفِ قل العفو" میں پوشیدہ حقیقت روس کے ہاتھوں نمودار ہوگی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ جس طرح مزدکیت کی عمارت ریت کی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی اس لئے چار دن تک بھی قائم نہیں رہ سکی تھی، اسی طرح روسی سوشلزم جس فلسفۂ حیات پر متشکل کی گئی ہے اس میں بھی اتنی سکت نہیں کہ وہ اس قدر وزنی عمارت کا بوجھ اُٹھا سکے۔ اس فلسفۂ حیات کا بنیادی نقص یہ تھا کہ اس کا سارا انداز منفیانہ تھا۔ مثبت کا پہلو کہیں نہیں تھا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

فکرِ اُو در تند بادِ لَا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند
(پس چہ باید کرد)

اسی لئے اس نے روس سے برملا کہا تھا کہ

در گذر از لَا اگر جویندۂ	تا رہِ اثبات گیری زندۂ

بلکہ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے (جاوید نامہ)

یہ اساسِ محکم قرآنی فلسفۂ حیات کے سوا کہیں نہیں مل سکتی۔

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

روس نے اپنے اقتصادی پروگرام کے لئے اساسِ محکم کو تلاش اور اختیار نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد رجعت اختیار کرنی پڑی' اور یوں یہ تحریک وہاں ناکام رہ گئی۔ اب اس کا تجربہ چین میں ہو رہا ہے لیکن چونکہ اساسِ محکم اس کے ہاں بھی نہیں اس لئے وہاں بھی یہ تحریک پروان نہیں چڑھ سکتی۔ علاوہ ازیں' انہوں نے اپنی ساری توجہات کا مرکز ایک شخصیت (ماؤزے تنگ) کو بنا رکھا ہے۔ وہ خدا کے منکر ہیں لیکن ماؤزے تنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لئے اس تحریک کی زندگی' ماؤزے تنگ کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ شخصیتوں کے ساتھ وابستہ تحریکوں کا انجام ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کائنات کی اس عظیم ترین شخصیت کے متعلق بھی — جس نے ایسا عدیم النظیر انقلاب برپا کر کے دکھایا تھا — کہہ دیا تھا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۳) محمدؐ بجز اس نیست کہ خدا کا پیامبر ہے۔ اس سے پہلے بھی خدا کے پیامبر آئے اور (اپنے فرائض بجا لانے کے بعد چلے گئے)۔ سو اگر کل کو یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا (تم یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اس کی ذات سے وابستہ تھا اس لئے اس کی موت کے ساتھ ختم ہو گیا) پھر سے اپنی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ اور اسی عظیم اصول کی وضاحت تھی جسے حضورؐ کے خلیفۂ اول' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے' آپؐ کی وفات کے بعد' جماعتِ مومنین سے خطاب کرتے وقت ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ جس شخص نے محمدؐ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی وہ تو سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے۔ لیکن جس نے خدا کی عبودیت اختیار کی تھی' اسے مطمئن رہنا چاہیئے کہ اس کا معبود حیّ و قیوم ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔" اس لئے جو نظام' خدا کے عطا کردہ اصولوں کے مطابق قائم ہو گا' اشخاص کی موت اور حیات سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جب تک ان اصولوں کا اتباع کیا جائیگا' وہ نظام پھلتا پھولتا چلا جائے گا۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ — (۱۴/۲۴) اس شجرِ طیّب کی طرح جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِىۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ

تُ اُكُلُهَا ۔ (۱۴:۲۴) وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب بھی رہے اور ثمربار بھی۔

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ زمانے کے تقاضوں نے نظامِ سرمایہ داری کے ردِعمل کے طور پر کمیونزم کو جنم دیا اور روس اور اس کے بعد چین نے اس کی پہلی اسٹیج (سوشلزم) پر عمل بھی کیا' لیکن اساسِ محکم کے نہ ہونے کی وجہ سے' یہ تحریکیں کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ تحریکیں ناکام ہوں گی تو نظامِ سرمایہ داری کا پھر سے دور دورہ ہو جائے گا۔ ایسا نہیں ہوگا۔ جہاں تک اس باطل نظام کا تعلق ہے' اس کی زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں۔ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

تو اس نے اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا۔ اب صورتِ حال یوں ہوتی کہ یہ نظام پلٹ کر آ نہیں سکتا اور اس کے ردِعمل کے طور پر مارکس کی کارگہِ فکر نے جس تحریک کو وضع کیا تھا وہ کسی اساسِ محکم کے فقدان کی بنا پر آگے چل نہیں سکے گی۔ اس لئے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بعد قرآن کے تجویز کردہ معاشی نظام ہی کا سکہ رواں ہوگا۔ اس کے لئے سرزمینِ پاکستان سب سے زیادہ سازگار ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ اسے حاصل

پاکستان میں

ہی قرآنی نظام کی اقامت کے لئے کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی کہ اس باب میں بھی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ جس طرح قریش کے تاجروں اور کعبہ کے برہمنوں نے' قرآنی انقلاب کی پُرزور مخالفت کی تھی' اسی طرح آج بھی مغربی استعمار اور مذہبی پیشوائیت نے اس کی مخالفت کے لئے متحدہ محاذ بنا لیا ہے۔ جس طرح اُس زمانے میں ابوجہل نے کعبہ کا دامن تھام کر اپنے معبودوں سے فریاد کی تھی کہ وہ محمدؐ کے برپا کئے ہوئے "فتنہ" کو روکیں' اسی طرح عصرِ حاضر کے ابوجہل بھی اپنے اپنے معبودوں کو پکار رہے ہیں کہ وہ "قرآنی" اور قرآنی انقلاب کی طرف دعوت دینے والوں کا نام و نشان تک مٹا دیں ــــ اور تماشہ یہ کہ یہ بھی اپنے معبودوں کو کعبہ کا دامن تھام کر ہی پکار رہے ہیں' اس لئے کہ کعبہ سے انہیں الگ کر لینے کے بعد ان کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہ جاتی ــ عہدِ رفتہ کے ابوجہل نے کہا تھا کہ ــــ

خوب مسید انم کہ سلماں مزدکی است ــــ یہ بھی قرآنی نظام کا نام لینے والوں کے متعلق دن رات پراپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔ لیکن آج کے آبائے جہل اور اُس زمانے کے ابوجہل میں ایک بیّن فرق ہے۔ اگر اس نے قرآن کے اصولِ مساوات انسانیہ اور مزدکی اشتراکیت کو باہمدگر مماثل سمجھا تھا تو یہ برنائے جہالت تھا (اسی لئے اُسے ابوجہل کہا گیا ہے)۔ لیکن عصرِ حاضر کے ابوجہل جو قرآنی نظامِ ربوبیت پر کمیونزم کا لیبل لگا رہے ہیں' برنائے جہالت ایسا نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے' برنائے سازش ایسا

کرتے ہیں۔ لیکن یہ بر بنائے جہالت ایسا کرتے ہوں یا بربنائے سازش، انہیں دل کے کانوں سے سن رکھنا چاہیے کہ جس طرح قریش کی سرمایہ داری اور برہمنیت کا متحدہ محاذ، قرآنی نظام کے سیلِ رواں کو روک نہیں سکا تھا، ان کی متحدہ مزاحمت بھی اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکیگی۔ ان کا مقابلہ انسانوں سے نہیں، سنت اللہ سے ہے ۔۔۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ (۳۳/۶۲)۔ سنت اللہ کسی کے روکے رکا نہیں کرتی۔ سورج اپنے وقت پر طلوع ہو کر رہتا ہے خواہ چمگادڑ ہزار واویلا مچائیں۔ اور اگر کوئی شخص چاہے کہ قرآن کی اس آواز کو قوت کے زور سے دبا دیا جائے تو اسے قرآن ہی کا یہ اعلان سن رکھنا چاہیئے کہ ۔۔۔ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۱۲/۲۱) خدا کو اپنے پروگرام پر پورا پورا غلبہ و اقتدار حاصل ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے نا آشنا ہیں۔ زندانِ یوسف سے ابھرا ہوا یہ غلغلہ انگیز نعرہ آج بھی ہر مستبد فرعون سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے نظام کے متعلق یہ دعوے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔۔۔ کسی انسان کا ادعائے باطل نہیں، خدائے کائنات کا مبنی علی الحق دعوے ہے جو کبھی ناکام نہیں رہ سکتا ۔۔۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔۔۔ خواہ مشرکین پر یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ قرآن نے یہاں "مشرکین" کہہ کر ایک لطیف حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کافر وہ ہے جو حق سے یکسر انکار کرتا ہے۔ لیکن مشرک اُسے کہتے ہیں جو حق اور باطل میں مفاہمت (COMPROMISE) چاہتا ہے۔ یہ شخص (ایمان تو بہت بڑی چیز ہے) کفر میں بھی پختہ نہیں ہوتا، وہ زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر شرک پر اتر آتا ہے۔ وہ نظامِ سرمایہ داری کی کھل کر حمایت نہیں کر سکتا تو اس میں قرآن کے نظامِ معیشت کا تھوڑا سا پیوند لگاتا ہے، اور اس طرح

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

لیکن یہ اس کی بھول ہے۔ خنزیر کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرنے سے، وہ حلال نہیں ہو جاتا۔ بازارِ کائنات میں تو کفرِ خالص اور ایمانِ خالص، دو ہی اجناس کا شمار ہوتا ہے۔ پیوند سازی کے شرک کا وہاں کوئی چلن نہیں۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

صدرِ اول میں جب قرآن کے اس انقلابی پروگرام کی آواز بلند ہوئی تو اس ٹکراؤ میں ایک طرف مسلمانوں کی جماعت تھی؛ اور اس کی مخالفت میں دوسری طرف غیر مسلم ـــ مکہ کے قریش، مدینہ کے یہودی، ایران کے مجوسی اور روما کے نصاریٰ وغیرہ ـــ یعنی اس وقت اسلام کا مقابلہ کھلے ہوئے کفر سے تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں جب سرمایہ دار قوموں نے دیکھا کہ ان کے نظام کی بساط اُلٹنے کو ہے تو ہر چند ان کا نہج زندگی سیکولر تھا۔ انہوں نے پکار کر دنیا کے خدا پرستو اٹھو اور اس ابھرنے والے فتنہ کو کچل کر رکھ دو۔ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ۔ (۲۱/۶۸) ـــ اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو کر دیہ کہ اٹھو۔ اسے زندہ جلا دو۔ اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو ـــ پیشہ ور خدا پرست نہایت سہل الحصول اور بڑی سستی جنس ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ نہایت سستے داموں بکے اور سرمایہ داری کی مدافعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب مسلمان ممالک میں حالت یہ ہے کہ جو نہی کسی نے یہ آواز بلند کی کہ بھوکوں کو روٹی ملنی چاہیئے "خدا پرستوں" کی ایک جماعت ' خدا اور رسولؐ کے نام کا ورد کرتے ' قرآن نیزوں پر لٹکاتے ' اس کی مخالفت کے لئے صف آرا ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ممالک میں ' جہاں مذہبی پیشوائیت کا اس قدر زور ہے ' اس آواز کا ابھرنا کس قدر دشوار ہے۔ مودودی صاحب ' تاریخ کے ایک ایسے مقام کا ذکر کرتے ہوئے جہاں (ان کے خیال میں) اسلامی نظام کی جگہ نظامِ جاہلیت لے رہا تھا، لکھتے ہیں۔

> سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار۔ رسالت کا اقرار، صوم وصلوٰۃ پر عمل۔ قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برا ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہیں کر سکیگا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔

(تجدید و احیائے دین ۔ ترجمان القرآن ۔ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء ـ ص ۳۵)

لیکن مشکلات ہزار ہوں ' قارون اور ہامان کی ملی بھگت اب کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ خدا کا دین ـــ جسے ہر

نظام پر غالب آکر رہتا ہے ۔۔۔ نہ کسی خاص ملک سے وابستہ ہے نہ کسی خاص قسم کا نام رکھانے والی قوم سے۔ وہ فطرت کے اٹل قوانین کی طرح عالمگیر واقع ہوا ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی ان اصولوں کو اپنائے گی وہ اس کے ثمرات سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا جی یہی چاہتا ہے کہ اس انقلابِ محمدیؐ سے بہرہ ور وہی قوم ہو جو اپنی نسبت محمدؐ کی طرف کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی تمام عمر اپنا اولین مخاطب اسی قوم کو سمجھا ہے ۔۔۔ لیکن وہ اگر اس کی سعادتوں سے بہرہ یاب ہونا ہی نہ چاہے تو اسکی قسمت کو کون بدل سکتا ہے۔ یہی وہ احساس تھا جس سے مجبور ہو کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمہ ما بے اثر افتاد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیشِ ما بردارد رخش — پیشِ قومے دیگرے بگذارد رخش
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

اور یہ درحقیقت تفسیر ہے قرآن کریم کی اس عبرت آموز اور لرزہ انگیز وعید کی جس میں کہا گیا ہے کہ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۔ تم وہ ہو کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے مال و دولت کو نوعِ انسان کی بہبود کے لئے کھلا رکھو تو تم میں وہ لوگ ابھر آتے ہیں جو اسے اپنی ذات تک سمیٹ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۔ جو دولت کو صرف اپنے لئے سمیٹ کر رکھتا، اور دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہے۔ اسے سمجھ رکھنا چاہیئے کہ وہ اس سے دوسروں کو نہیں، بلکہ خود اپنے آپ کو محروم کر لیتا ہے۔ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۔ اے رسول! ان سے برملا کہہ دو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں، تم خدا کے محتاج ہو۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا ۔ اگر تم خدا کے متعین کردہ نظام سے پھر گئے تو تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۔ وہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی کہ

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زماں و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست — احتیاجِ روم و شام اور اکجاست

اور ایسا ہو کر رہے گا ۔ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۔

والسلام!

محمد سعید العامودی
شاہد عادل

علامہ عبدالرحمٰن الکواکبی

(صاحب کتاب طبائع الاستبداد)

عصرِ حاضر کی ایک عظیم حریت پسند، دین آشنا ہستی

سعودی عرب کے مشہور علمی و دینی رسالہ "المنہل" کے تازہ شمارے (مارچ ۱۹۷۹ء) کی اشاعت میں ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کے دورِ جدید کی ایک اہم ترین مگر گمنام ہستی علامہ عبدالرحمٰن الکواکبی پر ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت اس نام سے عامۃ الناس تو ایک طرف، شاید اکثر اہلِ علم بھی واقف نہ ہوں گے۔ لیکن ایک دور وہ تھا جب اس نام نے ساری اسلامی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اور انہیں عام طور پر جناب جمال الدین افغانیؒ اور مفتی محمد عبدہٗ جیسی جلیل القدر ہستیوں کے ہمدوش تصور کیا جاتا تھا۔

معلوم نہیں وہ کون سے عوامل تھے جن کی وجہ سے امتِ مسلمہ کی یہ اہم ترین ہستی ہمارے ہاں گمنام ہوتی گئی۔ لیکن جہاں تک عرب ممالک کا تعلق ہے، وہاں علامہ الکواکبی کی زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق اتنا کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے کہ شاید جمال الدین افغانیؒ اور مفتی محمد عبدہٗ کی زندگی پر بھی نہ ہوا ہو۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کوئی ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور یہ کتابیں لکھنے والے کوئی معمولی اہلِ قلم نہیں بلکہ دنیائے عرب کے مشہور اہلِ علم ہیں۔ ان میں سے علامہ احمد امین، ڈاکٹر ساتی دھان، محمد شاہین حمزہ، قدری قلعجی، محمد احمد خلف اللہ اور خود ان کے ہمنام پوتے ڈاکٹر عبدالرحمٰن الکواکبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عرب دنیا میں ان کی مقبولیت کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں، بلکہ وہاں کے جن علاقوں کے علماء تجدد پسندی کے زمرے میں شمار نہیں کئے جاتے! الکواکبی ان کے نزدیک بھی یکساں مقبولیت

کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس وقت الکواکبی پر جو شاندار مقالہ ہمارے پیشِ نظر ہے، وہ مجلہ رابطۃ العالم الاسلامی کے ایڈیٹر شیخ محمد سعید العامودی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اور المنھل کے حج نمبر بابت مارچ ۶۹ء میں شائع ہوا ہے۔ علمائے عرب کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جو علمی چیزیں ان کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہیں وہ انہیں حج کے موقع پر شائع کر کے دنیائے اسلام کے زیادہ سے زیادہ اہلِ علم تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ مقالہ بھی حج ہی کے موقع پر سعودی عرب کے سب سے زیادہ مقبول رسالہ میں شائع کیا گیا ہے۔

ذیل میں ہم الشیخ محمد سعید العامودی کے مقالہ اور خود علامہ الکواکبی کی مشہور تصنیف "ام القریٰ" کے مقدمہ سے ان کے حالات زندگی مختصراً پیش کرتے ہیں۔ الشیخ العامودی اپنے مقالہ کی ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں:-

السید عبد الرحمٰن الکواکبی صاحب کتاب المشہور "اُمّ القریٰ" شخصیۃ راشدۃ عظیمۃ فی تاریخ الاسلام الحدیث۔ (المنھل مارچ ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۶۲)

سید عبد الرحمٰن الکواکبی جو مشہور کتاب "اُمّ القریٰ" کے مصنف ہیں۔ جدید تاریخ اسلام کی ایک بڑی ہی عظیم شخصیت ہیں۔

آپ کی پیدائش شام کے مشہور شہر حلب میں ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں ہوئی۔ اور انہوں نے ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں مصر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ شام کے ایک قدیم علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کا ایک اپنا قدیمی دینی مدرسہ "مدرسۃ الکواکبیۃ" کے نام سے مشہور تھا جو اس علاقے کے لوگوں کے لئے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ نے بھی اپنی دینی تعلیم کی تکمیل اسی مدرسے سے کی۔ مقامِ حیرت و مسرت ہے کہ ان کا خاندان اس گئے گزرے دور میں بھی اپنی پرانی علمی روایات کو قائم رکھے چلا آرہا ہے۔ اور آپ کے ہمنام پوتے، ڈاکٹر عبد الرحمٰن الکواکبی، کا شمار جید اہلِ علم میں ہوتا ہے۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد آپ نے اپنی زندگی کا آغاز سرکاری ملازمت سے کیا۔ اس وقت عربی ممالک عثمانی عملداری میں شامل تھے۔ لیکن انہوں نے جس قسم کا مزاج پایا تھا اس میں سرکاری ملازمت کا نبھانا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کی طبیعت صحافت کی طرف زیادہ مائل تھی۔ چنانچہ ملازمت کے دوران ہی انہوں نے کئی ایک رسالے جاری کئے جن میں سے "الشھباء" نے تو خاصی شہرت حاصل کرنی شروع کی۔ لیکن یہی شہرت ان کے لئے وبالِ جان بن گئی۔ مخالفت تو ایک طرف "اپنوں" کا حسد بھی اس حد تک پہنچ گیا کہ آپ کے لئے اپنے آبائی شہر "حلب" میں رہنا بھی دشوار ہو گیا۔ چنانچہ

آپ نے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر دنیائے عرب کے علمی مرکز یعنی مصر کی طرف ہجرت کر لی۔

مصر نے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور وہاں کے مشہور علمی رسالہ المؤید نے آپ کی پہلی کتاب "طبائع الاستبداد و مصارع الاستعباد" کو بالاقساط شائع کرنا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ ان کا نام برق رفتاری سے عرب دنیا تو ایک طرف، تمام دنیائے اسلام میں پھیل گیا۔

علامہ الکواکبی پر، علامہ احمد امین کی کتاب کو سب سے زیادہ معیاری تصور کیا جاتا ہے، اس لئے ان کی شخصیت پر جو اہل علم بھی قلم اٹھاتے ہے وہ ضرور ان کی کتاب سے اقتباسات پیش کرتا ہے۔ چنانچہ شیخ محمد سعید العامودی نے بھی اپنے مقالہ میں اکثر مقامات پر انہی کی آراء کو کثرت سے نقل کیا ہے۔ ان کی سیرت کے متعلق علامہ احمد امین لکھتے ہیں۔

"ان کی زبان بڑی مؤدب تھی۔ بات بڑی جچی تلی کرتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی کے سلام کا جواب بھی بڑے غور و فکر سے دیا کرتے تھے۔ غرضیکہ ان کی زبان سے فضول تو کیا، کوئی زاید بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ دورانِ گفتگو اگر کوئی ان کو ٹوک دیتا تو وہ فوراً خاموش ہو جاتے اور قطع کلامی کرنے والے کو اپنی بات کے پورا کرنے کا موقع دیتے۔ اسکے بعد الکواکبی اپنی بات کو وہاں سے شروع کرتے جہاں سے خاموش ہوئے تھے۔ اس طرح وہ اپنے ہمکلام کو گفتگو کے آداب سکھانے کی کوشش کرتے۔"

احمد امین آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"وہ بڑے نیک نفس انسان تھے۔ کسی قسم کا لالچ یا عہدہ ان کی طبیعت کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ جو بات کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے اور پوری جرأت سے کام لیتے تھے۔ اپنی اسی جرأت و بیباکی کی وجہ سے ان کو کئی بار قید و بند اور جائیداد کی ضبطی کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر مصر چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔"

"ان کے کریکٹر کی بلندی کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جہاں وہ اپنے سے بڑے لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتے تھے وہاں وہ غریبوں اور بیکسوں سے نہایت انکساری سے پیش آتے تھے وہ ان کے مخلص ہمدرد تھے اور ہمیشہ ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ جو بھی ان کی مجلس میں بیٹھے اس کی گفتگو جچی تلی ہو، رائے متوازن ہو۔ اس کی فکر دوسروں کی راہ نمائی کرنے والی ہو۔ حق سے اسے محبت ہو اور وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے جب بھی ضرورت پڑے قربانی دینے سے دریغ نہ کرے۔"

"الکواکبی کی زندگی میں ہمیں سب سے زیادہ اہم بات یہ ملتی ہے کہ ان کے شعور نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی

حالت کا گہرا تاثر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی امتِ مسلمہ کی بہبودی کے لئے وقف کر دی۔ مسلمانوں کے امراض کی صحیح تشخیص کے لئے انہوں نے تمام اسلامی دنیا کا دورہ کیا۔ تاکہ اس کے بعد اس کا مناسب علاج تلاش کیا جائے۔

اس اہم کام کی ابتداء انہوں نے یوں کی کہ پہلے تو مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا پھر اپنے زمانے میں مسلمانوں کی دگرگوں حالت کے بارے میں اخبارات، رسائل یا کتابوں میں جو کچھ لکھا جا رہا تھا اس پر نظر عمیق ڈالی۔ پھر اس مطالعہ کی روشنی میں مملکتِ عثمانیہ کے مسلمانوں کی اُس وقت کی حالت پر غور کیا۔ اس کے بعد دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی حالت کا موقع پر جائزہ لینے کے لئے، مشرقی افریقہ، مغربی ایشیا اور برصغیر ہند و پاک کی مسلمان مملکتوں کا دورہ کیا۔ اس انداز کے تفصیلی مطالعے کے بعد انہوں نے جو کچھ محسوس کیا انہیں مختلف مقالات اور کتابوں کی شکل میں امت کے سامنے پیش کیا۔ اس موضوع پر ان کی دو کتابوں نے خاصی شہرت حاصل کر لی۔ یعنی

(۱) طبائع الاستبداد و مصارع الاستعباد۔ (۲) اُمّ القریٰ۔

اول الذکر کتاب میں انہوں نے استبداد کی مختلف شکلوں کی تصریح کی ہے اور پھر دین، سیاست، علم، اخلاق اور تربیت وغیرہ پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، انہیں علیحدہ علیحدہ ابواب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اُس وقت اس کتاب نے مسلمانوں کی زندگی پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔

اُن کی دوسری کتاب 'اُمّ القریٰ' کا نام پڑھ کر تو ہمیں یہ اندازہ ہوا تھا کہ یہ شاید مکہ معظمہ کی تاریخ ہوگی۔ لیکن اس کے مضامین بالکل دوسری نوعیت کے نکلے۔ یہ دراصل ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کی ایک بڑی مفصل روئیداد ہے، جو مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی تھی اور صرف اسی نسبت کی وجہ سے اس کا نام "اُمّ القریٰ" رکھا گیا۔ بعد کے محققین کا خیال ہے کہ یہ "اسلامی کانفرنس" واقعتاً منعقد نہیں ہوئی تھی بلکہ علامہ الکواکبی کی تخیلی تخلیق تھی اور اس نے تمام کے تمام مندوبین فرضی اور ان کے ذہن کی پیداوار تھے۔ تاہم حقیقت معاملہ جو کچھ بھی ہو، اس کتاب میں کانفرنس کی جس قدر مفصل اور جزئی تفصیلات جمع کی گئی ہیں اور مختلف ممالک کے مندوبین کے درمیان جس بحث و مباحثہ کو نقل کیا گیا ہے، اس سے یہ تخیلی تخلیق بھی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ قاری یہاں تک تاثر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کانفرنس گویا اب بھی اس کے سامنے منعقد ہے۔

قارئین کو شاید اس سے حیرت ہو کہ علامہ الکواکبی کو ان کی تجدد پسندی کے باوجود سعودی عرب جیسے قدامت پرست ملک میں کیوں عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو گی کہ وہ تقلید کے

سخت دشمن تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مقالہ نگار جناب محمد سعید العامودی نے انہیں محمد بن عبدالوہاب کے سلسلے ہی کی ایک کڑی قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو رسالہ المنہل۔ مارچ ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۶۲۵)

الکواکبی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے مختلف اسلامی ممالک کے مندوبین کو ان الفاظ سے خطاب کرتے ہیں۔

ثم یا ایها الاخوان انکم کذالك تستصوبون ان نترك جانبا اختلاف المذاهب التی نحن متبعوها تقلیدا فلا نعرف ماخذ کثیرا من احکامها۔ و ان نعتمد ما نعلم من صریح الکتاب و صحیح السنة و ثابت الاجماع و ذالك لکیلا نتفرق فی الاراء۔

(ام القری۔ صفحہ ۱۵)

پھر اے میرے ساتھیو! میں آپ سے توقع کرتا ہوں کہ اس وقت آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ان تمام فقہی مذاہب کو جن کی ہم پیروی کرتے چلے آتے ہیں نظر انداز کر کے اس کانفرنس میں حصہ لیں۔ کیونکہ ہم ان فقہی مذاہب کی پیروی تو تقلیداً کرتے آتے ہیں۔ اور فقہ کے بہت سے احکام کی اصل تک نہیں جانتے۔ اس کانفرنس میں ہمیں صرف قرآن مجید، صحیح احادیث، اور اجماع ثابت پر اعتماد کرنا ہوگا۔ تاکہ ہماری رایوں میں اختلاف نہ ہو۔

اس بین الاقوامی کانفرنس میں تمام اسلامی دنیا کے مندوبین کے درمیان بحث مباحثہ کے بعد مسلمانوں کی مندرجہ ذیل بیماریوں کی نشاندہی کی گئی۔

(۱) عقیدہ جبر کے امت پر مضر اثرات۔

(۲) مسلمانوں کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک کر دینا۔

(۳) دین اسلام سے زبانی ہمدردی اور زبانی دعووں کے سوا کامل غفلت۔

(۴) علوم دینیہ کے حصول سے بے رغبتی۔

(۵) دنیاوی علوم سے ایسی مجرمانہ غفلت کہ ہم سوئی تک کے لئے غیروں کے محتاج ہو گئے۔

(۶) مخلص اور دیانتدار قیادت کا فقدان۔

(۷) غربت و افلاس۔ (المجلة المنهل۔ مارچ ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۶۲۷)

اس آخری بیماری کو وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے الفاظ میں یہ فائد کل شر و رائد کل نحس ہے۔ یعنی غربت ہر برائی اور ہر نحوست کی جڑ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں

کی ان وہبی وہ تہذیبی بیماریوں کو دور نہیں کیا جائے گا اُن کے لئے موجودہ دور میں ترقی کرنا ممکن نہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ کسی آئندہ فرصت میں "ام القریٰ" کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے)۔ اس وقت ہم علامہ کی پہلی کتاب "طبائع الاستبداد" کے باب "الاستبداد والدین" کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ یہ باب اصل کتاب میں صفحہ ۱۵ تا ۳۲ تک پھیلا ہوا ہے۔

الاستبداد و الدین - (دین اور استبداد)

اس باب کے شروع میں مصنف اس بحث کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو وہ کتاب کے پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں اور جس کا عنوان ہے "استبداد کیا چیز ہے؟" اس میں انہوں نے استبداد کی مختلف صورتوں کی تصریح کی ہے۔ اس کا خلاصہ ان کے الفاظ میں کچھ یوں بنتا ہے کہ استبداد سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایک فرد یا چند افراد کا مجموعہ متعلقہ معاملات کو کسی قسم کی ذمہ داری اور مسئولیت سے بے نیاز ہو کر اپنی مرضی کے مطابق سرانجام دیں۔ اس کے بعد اس باب کا دوسرا پیرا یوں شروع ہوتا ہے۔

اکثر یورپی علمائے سیاست کا خیال ہے کہ سیاسی استبداد مذہبی استبداد سے پیدا ہوتا ہے۔ تاہم ان میں سے بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ اگرچہ ان میں یعنی سیاسی اور مذہبی استبداد میں اتنا گہرا تعلق تو نہیں جتنا باپ اور بیٹے میں ہوتا ہے تاہم یہ ایک دوسرے کے بھائی ضرور ہیں۔ ان دونوں کے درمیان یہ محکم تعلق ہے کہ یہ دونوں انسان کی غلامی اور ذلت کے لئے ایک دوسرے کے مدد و معاون بنتے ہیں۔ تاکہ ایک کی حکومت جسم پر قائم رہے اور دوسرے کی روح پر۔ ان علماء کا کہنا ہے کہ (خود ساختہ) مذہبی تعلیمات اور آسمانی کتابوں کے نام سے انسان کو ایک ایسی ہیبت اور ہولناک طاقت سے ڈرایا جاتا ہے جس کی کیفیت کا علم اس کے دائرہ عقل و ادراک سے ماورا ہوتا ہے۔ شریعت کے نام پر انسان کو اس دنیا میں سخت ترین مصائب و آلام کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور موت کے بعد دردناک عذاب کا خوف۔ چنانچہ ان دھمکیوں سے انسان کا جسم لرز جاتا ہے؛ اعضا سن ہو جاتے ہیں اور عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس تعلیم کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر طرح کے خرافات و اوہام کے سامنے سر جھکانے اور ہر شے سے خوف زدہ ہونے لگتا ہے۔

مذہب کے نام پر اس طرح ڈرانے اور دھمکانے کے بعد ہر انسان کو وہ دروازہ دکھایا جاتا ہے جس میں داخل ہونے کے بعد وہ تمام دنیاوی اور اُخروی مصیبتوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن ان دروازوں پر مذہبی پیشواؤں کی دربانی ہوتی ہے جو احبار و رہبان یعنی علماء اور مشائخ کا لباس زیب تن کئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص ان دروازوں سے نہیں گذر سکتا۔ صرف اس شخص کو گذرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو اس کی فیس پیشگی ادا کر دے۔ یہ فیس ان مذہبی پیشواؤں کے حضور کبھی دل و جان سے تعظیم و تکریم کی

شکل میں پیش کی جاتی ہے اور کبھی اس کے ساتھ مال و دولت، یا حکومت کی طرف سے ان مقدس دربانوں کے لئے کسی خطیر رقم کا مقرر ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اگر مذہبی پیشواؤں کی یہ فیس ادا نہ کی جائے تو وہ روح کو اس کے مالک تک نہیں پہنچنے دیتے۔ اور یہ بیچاری اس وقت تک برابر اُدھر لٹکتی رہتی ہے جب تک کہ یہ مذہبی پیشوا اپنا حق وصول نہیں کر لیتے۔

علمائے سیاست کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ایک مستبد حکمران بھی اپنا استبداد اسی قسم کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔ وہ بھی اپنی ذاتی شان و شوکت، خاندانی تفاخر، غرور اور نخوت، سرکاری جبر اور قتل و نہب کی ہولناکیوں کے ذریعہ انسان کو اس حد تک ذلیل و خوار اور مرعوب و مجبور کر دیتا ہے کہ وہ از سرتاپا وفادار اور خادم بن جاتا ہے۔ بلکہ اس استبداد کا مطمع نظر یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت ایک وفادار جانور سے زیادہ نہ سمجھے اور اس عقیدہ کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دے کہ اس کی پیدائش کا مقصد وحید حاکم کی خدمت گذاری اور فرمانبرداری ہے۔ اسی بنا پر ان علمائے سیاست کا یہ خیال ہے کہ سیاسی اور مذہبی استبداد کی اس شدید باہمی مشابہت کی وجہ سے انسانی آبادی کا بیشتر حصہ یعنی عوام اپنے حقیقی معبود اور ظالم حاکم کے درمیان چنداں فرق محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے کہ انہیں ان دونوں کی تعظیم کرنی پڑتی ہے۔ دونوں کے سامنے بے چون و چرا اپنا سر جھکانا پڑتا ہے۔ دونوں کو یکساں طور پر حاکم مطلق تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس طرح خدا کی ذات ہر قسم کی باز پرس سے بلند و بالا ہستی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح ایسے حکمران کے لئے بھی خدائی حقوق کی سند عطا کر دی جاتی ہے۔

اس حقیقت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ مذہبی پیشواؤں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے بیچارے عامۃ الناس اپنے معبود حقیقی اور ظالم حکمران کو بہت سے حالات و صفات میں مشترک پاتے ہیں، اس لئے ان ظالم حکمرانوں کی تعظیم و تقدیس بھی قدرتی طور پر ویسے ہی خوف اور امید (بیم و رجا) کے ساتھ کی جاتی ہے جیسے معبود حقیقی کی۔ اس لئے کہ عامۃ الناس میں اتنی سوجھ بوجھ تو ہوتی نہیں کہ وہ صفاتِ ربانی مثلاً لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ۔ مُنْعِمٌ اور جَلَّ شَانُہٗ کے مقابلے میں شاہی القاب، مثلاً غیر مسئول، ولی نعمت، اور جلیل القدر میں فرق کر سکیں۔ (وہ دونوں کو ہم مرتبہ سمجھتے ہیں) یہ اسی صورتِ حالات کا نتیجہ تھا کہ گزشتہ زمانوں میں ظالم حکمرانوں کو موقع مل گیا کہ وہ خدائی کا دعویٰ کریں۔ ان دعووں کی نوعیت اور ان کی کامیابی کا دارومدار رعایا کی ذہنی استعداد کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر ہی تو کہا گیا ہے کہ ہر مستبد اپنے لئے قدوسیت کی کوئی نہ کوئی شان ضرور تجویز کرتا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس خطۂ ارض پر خدا کا شریک و سہیم بن سکے اور

اگر اس درجہ کی کامیابی کا امکان نہ بھی ہو، تو بھی کم از کم اسے ایک نہایت ہی برگزیدہ اور محبوب ہستی مانا جا سکے۔ اور اگر اس درجے کی کامیابی بھی ممکن نہ ہو تو اتنا تو ہر مستبد حکمران ضرور کرتا ہے کہ استبداد پسند مذہبی پیشواؤں کو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ ملا لیتا ہے، جو خدا اور مذہب کا نام لے کر مخلوق پر اس حاکم کے ظلم و ستم کے شکنجے مضبوط کرتے رہتے ہیں۔

اہل علم اس نظریہ کی تائید میں ایسے تاریخی واقعات کی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے بانی شاہ قسطنطین کا اپنی مملکت میں مذہب کی اشاعت پر سرگرمی سے کاربند ہونا، اسپین کے شاہ فلپ ثانی اور انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کا مذہب کی حمایت میں اس زور شور سے اٹھنا اور محکمۂ احتساب قائم کر کے بدعقیدہ لوگوں کا اس بے باکی سے خون بہانا، حاکم بامر اللہ فاطمی اور دوسرے عجمی بادشاہوں کا صوفیہ و مشائخ کی تائید و اعانت میں اس قدر فیاضی سے کام لینا اور جا بجا زاویے (تکیے) اور خانقاہیں قائم کرنا یہ سب اس لئے تھا کہ مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی ہمدردیاں حاصل کر لی جائیں اور پھر ان ہمدردیوں کی آڑ میں اپنے ظلم و جور کو بے روک ٹوک جاری رکھ سکیں۔

ان ماہرین کی یہ رائے ہے کہ مذہبی اور سیاسی استبداد کے مابین ایک ایسا قوی رشتہ موجود ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں ایک جاتا ہے وہاں دوسرے کا پہنچنا بھی یقینی ہے۔ جب ایک زائل ہوتا ہے تو دوسرا بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ یا جب ایک میں کمزوری یا اصلاح ہوتی ہے تو دوسرے میں بھی ایسا تغیر ضرور آ جاتا ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ عیسائی مذہب کی مثال پیش کرتے ہیں کہ جب پروٹسٹنٹ فرقہ کی شکل میں اس میں اصلاح ہوئی اور سیکسونی اقوام میں یہ فرقہ مقبول ہو گیا تو ان اقوام میں سیاسی استبداد میں بھی تخفیف و اصلاح ظاہر ہونی شروع ہو گئی۔ اس کے برعکس عیسائیوں کے دوسرے بڑے فرقے یعنی کیتھولک مذہب نے کسی قسم کی مذہبی اصلاح قبول نہ کی۔ اس لئے جن اقوام میں یہ مذہب مقبول تھا ان کی سیاسی اصلاح بھی وسیع پیمانے پر نہ ہو سکی۔

یونانی دیومالا

قصہ مختصر یہ کہ تمام علمائے سیاست کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سیاست و مذہب ہمیشہ شانہ بشانہ چلتے ہیں اور یہ کہ سیاسی اصلاح کا سب سے زیادہ آسان اور قریب راستہ مذہبی اصلاح ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب کے ذریعے سیاسی اصلاح کی ابتدا سب سے پہلے حکمار یونان نے کی۔ انہوں نے اپنے مستبد اور سرکش حکمرانوں کو پابند کرنے اور ان کا اقتدار توڑنے کے لئے یہ چال چلی کہ توحید الٰہی کی جگہ شرک کو رواج دیا۔ یہ عقیدہ انہوں نے شوریوں سے اخذ کیا اور مصری افسانوں کے خرافات کی اس میں رنگ آمیزی کر کے یہ سوانگ رچایا کہ نظام کائنات ایک خدا کے ہاتھ میں نہیں

بلکہ متعدد معبودوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر معبود ایک خاص شعبہ پر نگرانی کرتا ہے اور اپنے دائرہ عمل میں پوری طرح آزاد ہے۔ چنانچہ اس تقسیم کے تحت، عدل و انصاف کی باگ ایک دیوتا کے ہاتھ میں ہے تو جنگ دوسرے کے پاس۔ اور سمندر تیسرے کے قبضے میں۔ کوئی بارش کا دیوتا ہے اور کوئی محبت کا۔ غرضیکہ ہر کام کے لئے ایک علیحدہ دیوتا قائم کیا گیا اور پھر ان سب دیوتاؤں کے اوپر ایک بڑا دیوتا جسے خدا کہتے ہیں۔ اور جسے ان تمام دیوتاؤں کی نگرانی اور ان کے باہمی اختلافات میں مداخلت کا منصب حاصل ہے۔

جب یونان کے فلسفیوں نے اپنی فصاحت اور قوتِ استدلال کے ذریعے عامۃ الناس کے دلوں میں اس "دیومالائی نظام" کا عقیدہ پختہ کر دیا تو انہوں نے بڑی آسانی سے ان کے سیاسی نظریات کو بھی قبول کر لیا کہ بادشاہ بھی اپنے خدائی حقوق والے مقام سے نیچے اتریں اور زمین پر بھی حکومت کا وہی نظام قائم ہو جو آسمان پر ہے۔ چنانچہ فلاسفہ کے اس سیاسی نظریہ کی ایسے جوش و خروش سے تائید و حمایت ہوئی کہ بالآخر جابر بادشاہوں کو اس نئے نظام کے آگے سر جھکانا پڑا۔ چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر یونان میں کئی مقامات، مثلاً ایتھنز، اسپارٹا وغیرہ میں بادشاہتیں ختم کر کے جمہوری حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس تجربہ کا اثر یونان کے قرب و جوار مثلاً روما پر بھی پڑا۔ بلکہ فلاسفۂ یونان کے اس سیاسی اصول کی مقبولیت ہی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں، خواہ بادشاہی ہو یا جمہوری تماشا، نظامِ حکومت ہر جگہ مختلف محکموں میں تقسیم ہوتا ہے اور ہر محکمے کا انچارج ایک علیحدہ وزیر ہوتا ہے۔

باطل عقیدہ شرک

لیکن یونانی فلاسفروں کا یہ اصول ایک باطل عقیدہ یعنی معبودِ حقیقی سے شرک پر مبنی تھا۔ اس غلط اصول کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس نے بادشاہت کی جڑیں ہلا دیں، لیکن مختلف امور کے لئے مختلف دیوتاؤں کے تصور نے مختلف طبقوں کے چالاک لوگوں کو روحانی تصرفات اور صفاتِ ربانی کے مظہر ہونے کے بے دھڑک دعویٰ کرنے کے مواقعات حاصل ہو گئے جن کی اس سے پہلے چند جابر بادشاہوں کے علاوہ کسی اور کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ تاہم یہ غلط عقیدہ مختلف وجوہات کی بنا پر عام انسانی طبیعتوں کے عین موافق تھا۔ اس لئے غیر معمولی سرعت سے مقبول ہو کر عام ہو گیا اور ایک دفعہ پھر اس کے ذریعے مستبد حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کے حامیوں اور خادموں کی فوجیں تیار ہوتی رہیں۔

یہودیت اور تورات

اس مشرکانہ دور کے بعد تورات آئی۔ اور اپنے ساتھ ایک نئی روح اور ایک نیا نظامِ عمل لائی۔ اس نے بنی اسرائیل کے ہاں سے شرک کی عمارت گرا دی اور دیوتاؤں کی جگہ فرشتوں کو دے دی لیکن بعض یہودی بادشاہوں کو توحید خالص مطلق پسند

نہ آئی۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ذاتی مفاد کے لئے خالص توحید میں دست اندازی کرتے رہے اور اس طرح انہوں نے اس کے حقیقی روپ کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

عیسائیت

اس کے بعد انجیل نے انکساری اور بردباری کی تعلیم دی۔ اور وحدانیت باری تعالےٰ پر از سرِ نو زور دیا۔ مگر عیسائیت کے مبلغ ان پست اقوام کو جنہوں نے متمدن اقوام سے پہلے ان کی دعوت قبول کی تھی، اصل عیسائیت کی یہ تعلیم کما حقہٗ نہ سمجھا سکے کہ "باپ بیٹے" کے الفاظ مجازاً استعمال کئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان اقوام نے یہ الفاظ حقیقی معنوں میں سمجھ لئے اور یہ یقین کر لیا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام سچ مچ خدا تعالےٰ کے ویسے ہی بیٹے ہیں جیسے عام انسانوں کے نسبی بیٹے ہوا کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو بڑی تقویت اس امرِ واقع سے بھی پہنچی کہ وہ لوگ مستبد حکمرانوں کو پہلے ہی خدا کا بیٹا مانا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اسے گوارا نہ کیا کہ حضرت مسیح کو ان سے کم رتبہ پر رکھیں۔ اس طرح عیسائیت نے بھی بہت جلد سابق مذاہب کی طرح اپنا حقیقی رنگ بدل ڈالا اور ارباب کلیسا کی تعظیم و تکریم میں اس قدر غلو کیا کہ انہیں آسمانی بادشاہت کا نائب، معصوم، قانون سازی کا مختار، اور شریعت میں تغیر و تبدل کا مجاز قرار دے دیا۔ تاہم بعد میں پروٹسٹنٹ فرقے نے اس قسم کے اکثر امتیازات کو ختم کر دیا۔ اور ایک حد تک عیسائیت کی اصلاح کی۔

اسلامی دور

سب سے آخر میں دینِ اسلام عقل و حکمت کا علم بلند کئے ظاہر ہوا۔ اس نے شرک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، جمہوریت اور اریسٹاکریسی کے بین بین (اعتدال کی راہ پر) سیاسی آزادی کے اصول قائم کئے۔ توحید ربانی کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا اور دنیا کے سامنے خلافتِ راشدہ جیسی ایک ایسی حکومت پیش کی جس کی نظیر چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی ـــ حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں بھی پھر ویسی حکومت قائم نہ ہو سکی۔

خلفائے راشدین

خلفائے راشدین نے قرآن کو خوب سمجھا تھا۔ اسی پر ان کا عمل تھا اور وہی شمعِ ہدایت بن کر ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی روشنی میں ایک ایسی حکومت قائم کی جس نے ہر قسم کے امتیازات اٹھا دیئے اور غلام و آقا کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کو نہ کوئی امتیاز حاصل تھا اور نہ اس کی معیشت ہی کسی حیثیت سے دوسروں سے بہتر تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان اسلامی حکمرانوں نے مسلمانوں میں برابری، رواداری اور مشترک خانگی و اجتماعی زندگی کے ایسے گہرے رشتے قائم کر دیئے تھے جو ان بھائیوں میں بھی کم ملتے ہیں جو ایک ہی ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں پلتے ہیں اور ایک ہی ماں کی گود میں کھیلتے ہیں۔

مذہبی اقتدار کا خاتمہ

دین اسلام نے ہر قسم کے روحانی اور مذہبی اقتدار کا، جسے دورِ جدید میں تھیاکریسی کا نام دیا جاتا ہے، بالکلیہ خاتمہ کر دیا۔ اس کے ہاں نہ کوئی پوپ تھا اور نہ پروہت۔ بجز ایک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی انسان کو بھی معصومیت کا درجہ حاصل نہ تھا۔ اس نے وہ تمام ہتکڑیاں اور بیڑیاں توڑ دیں جنہوں نے پوری انسانیت کو جکڑا ہوا تھا اور وہ تمام امتیازات و اختیارات باطل کر دیئے جو دوسرے مذاہب میں مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہو گئے تھے۔

دین اسلام پر جہالت کا اثر

لیکن افسوس! صد افسوس! جاہلوں کے ہاتھوں یہ دین بھی مارا گیا۔ انہوں نے اس کی ہدایت پس پشت ڈال دی اور اس کی روشن پیشانی پر ذلت و خواری کی مہر لگا دی۔ افسوس کہ یہ دین وہی دین ہے جس کے حامی و مددگار، نیک اور بھلے لوگ، حکیم اور عارف سب کے سب دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں مٹ گئے۔ مستبد حکمرانوں نے یورش کی اور امتِ مسلمہ میں شقاق و نفاق، تفریق و تقسیم اور قتل و غارت گری سے کام لے کر اسے اپنی ہوسناکیوں کا آلہ بنا لیا۔ دیگر پیروانِ مذاہب کی طرح انہوں نے بھی اس میں ہر قسم کے اضافے کئے اور اسے اس درجہ بگاڑا کہ اب عامۃ الناس تو کیا خود خواص تک حق و باطل کی تمیز سے درماندہ نظر آتے ہیں۔ اس آسان دین کو اس قدر مشکل اور پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ اس کی موجودہ شکل میں کوئی بھی اس کے احکام و واجبات، فرائض و مستحبات و آداب پر پورا پورا عمل نہیں کر سکتا۔

تحریفِ دین کا نتیجہ

اس تحریفِ دین کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب امت مسلمہ اس مذہب پر نہ چل سکی تو اسے اپنی کوتاہی پر محمول کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ نجات و فلاح اور محاسبہ نفس کی یہ راہ ناقابلِ گزر ہے اور اس پر چلنا ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کی پستی اس قدر بڑھ جاتی ہے، تو اس کا نفس ذلیل ہو جاتا ہے، سر جھک جاتا ہے، آواز پست ہو جاتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جرأت کہ جس پر شریعت، نظامِ حکومت اور انصاف و عدالت کا معیار ہے، مفقود ہو جاتی ہے۔

مسلمان بادشاہ

امت کی اس غفلت اور کوتاہی نے سلاطین اور امراء کے سامنے ظلم و استبداد کی راہیں کھول دیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دلیری سے حدود اللہ کو توڑا اور امت مرحومہ کو ذلیل و خوار کر کے اپنا غلام بنا لیا۔

بعض اہلِ نظر نے ان تمام امور کا استقصاء کیا ہے جو اسلام میں نہ تھے مگر مسلمانوں نے غیروں سے اخذ کر لئے ہیں۔ مثلاً پاپائیت اور اس کے مظاہر، بزرگوں کی درجۂ عبادت تک تعظیم، اسلاف کی

مذہبی تقلید۔ عیسائیت کے بطریقوں، کارڈینل، سینٹ اور پادریوں کی طرح علیحدہ علیحدہ مذہبی عہدے، قدوسیوں کی ظاہری شکل وصورت کی نقل، پادریوں کا تجرد، دَیر کی طرح خانقاہوں کی تعمیر، رہبانیت کا رواج، عیسائی پیشواؤں کی طرح فرقی مراتب، لباس کی وضع قطع اور بالوں کی تراش خراش میں ایک امتیازی اختلاف، مساجد میں گرجا گھروں کے فنِ تعمیر کی نقل اور ان کی آرائش میں اسراف وغلو۔ اسلامی عبادتوں میں عیسائی عبادت کی تقلید، راگ وسرود (قوّالی وغیرہ) کا جزو عبادت قرار دینا۔ مسیحی گرجوں کی طرح قبروں پر سجدہ گاہوں کی تعمیر، بزرگوں کے مقبروں کی زیارت کے لئے خصوصی سفر، ان میں چراغاں کرنا، ان کے آگے جھکنا۔ اہلِ قبور سے طالبِ امداد ہونا۔ بزرگوں کے عماموں اور عصاؤں سے برکت حاصل کرنا۔ ولیوں کا حال سن کر سینے پر ہاتھ پھیرنا جس طرح عیسائی سینہ پر انگلی سے صلیب کا نشان بناتے ہیں۔

وحدۃ الوجود

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں مسلمانوں نے دوسروں سے لے کر دینِ اسلام میں داخل کر دی ہیں۔ چنانچہ "معرفت" کا تصور "مسیحی اسرار" سے مستعار لیا گیا۔ "وحدۃ الوجود" کا مسئلہ "حلول" سے، "مولد نبوی" کو "میلادِ مسیحی" سے، "محفل میلاد" کو "مسیحی عیدِ میلاد" سے۔ جھنڈے اٹھانا، صلیب اٹھانے سے۔ دیواروں پر خلفاء کے ناموں اور دعاؤں کا آویزاں کرنا، تصویروں اور بتوں کے دیواروں پر آویزاں کرنے سے۔ صوفیوں کا مراقبہ، بتوں کے سامنے آسن مار کر قلب کی یکسوئی کے لئے بیٹھنے سے۔ غرضیکہ یہ اور اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جو باہر سے آگئیں ہیں۔ دینِ اسلام کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔

کتاب وسنّت

اسی طرح کتاب وسنت سے براہِ راست ہدایت حاصل کرنے سے روکنا، رومن کیتھولک پادریوں سے ماخوذ ہے جو اپنے علاوہ سب کو انجیل کا علم حاصل کرنے سے روکتے تھے۔ یا یہودیوں سے جنہوں نے فہمِ تورات کا دروازہ بند کر دیا اور پورے مذہب کا دار و مدار "تلمود" پر رکھ دیا۔ اس کا چھوٹا بھائی، مسلمانوں کے ہاں فقہ کے نام سے مشہور ہے۔

اسی طرح افلاک کے ذریعے غیب کی باتوں کا معلوم کرنا، ستاروں کی گردش سے خوف زدہ ہونا، آگ کی تعظیم، لوبان دانیوں کو عبادت گاہوں میں رکھنا وغیرہ..... مجوسیوں سے لیا گیا ہے۔

بدعت

ان بدعات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب استبداد کو بڑھانے والی اور انسان کے پاؤں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالنے والی ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر تمام مذاہب کچھ سے کچھ ہو گئے اور انسان کے دل پر شقاوت چھا گئی۔ عیسائیت کے بگڑنے کی بھی یہی

وجہ ہوئی تھی۔ چنانچہ اب عیسائی محققوں نے تسلیم کرلیا ہے کہ ان کا پورا مذہب حتیٰ کہ عقیدۂ تثلیث بھی، جس پر موجودہ نصرانیت کا دارومدار ہے، محض اضافی شئے ہے۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال میں ان کا پتہ نہیں ملتا۔ موجودہ عیسائیت کی بنیادیں جن اصول و عقائد پر ہیں وہ سراسر من گھڑت ہیں۔ جن میں سے بعض تو عیسائیوں کی خود ساختہ ہیں اور اکثر دوسری قوموں سے مستعار لی گئی ہیں۔ چنانچہ ماہرینِ مصریات کو قدیم مصری عبادت خانوں اور قبرستانوں سے ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جن سے مسیحیت کی اکثر اضافیات کا پتہ چل گیا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے تالمود اور ان کی بدعتوں کی اصلیت بھی معلوم ہوگئی ہے کہ وہ کلدانی افسانوں اور خرافات سے ماخوذ ہیں۔ عیسائیت اور یہودیت ہی نہیں بلکہ مشرقِ قریب کے تمام مذاہب کی خرافات کے متعلق بھی تحقیق ہوگیا ہے کہ سب کی سب مشرقی حکماء و فلاسفہ کی گڑھی ہوئی ہیں اور اصل مذاہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

حرفِ آخر غرضیکہ جتنی بدعتوں نے بھی ایمان کا خوشنما چہرہ بگاڑا ہے، تمام کی تمام ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہیں اور ایک ہی مقصد رکھتی ہیں۔ یعنی انسان کو استبداد کی بوجھل زنجیروں سے جکڑ دیں۔ صرف جسم ہی کو نہیں بلکہ دل و دماغ کو بھی۔ کیونکہ آزاد دل و دماغ کسی حالت میں بھی استبداد قبول نہیں کرتا۔

(۰)

(مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ امت کو توحید خالص کی دعوت پر جمع کیا جائے۔ چنانچہ اسی کتاب میں انہوں نے جابجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً علم اور استبداد کے باب کے آخر میں فرماتے ہیں۔)

"بڑے بڑے مستبد ہی نہیں بلکہ معمولی درجہ کے مستبد بھی (جیسے مذہبی پیشوا، جاہل والدین، احمق شوہر، کمزور جماعتوں کے سردار) ہرگز پسند نہیں کرتے کہ ان کے ماتحت لوگ سچے خدا پرست بن جائیں۔ کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جس قوم میں توحید[1] خالص عام ہوگئی پھر وہ غلامی میں نہیں رہی، اور اپنی ہتھکڑیاں، بیڑیاں توڑ کر آزاد ہوگئی۔ لیکن بُرا ہو انسان کی کجروی کا کہ وہ یہ سب جاننے پر بھی اپنے پروردگار کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ دنیا کی ہر آستان کو چھوڑ کر صرف اسی کی چوکھٹ پر سر نہیں جھکاتا اور نافرمانی و ناشکری سے اپنے اور اپنے ہم جنسوں پر ظلم کرتا ہے۔"

یہ ہیں علامہ الکواکبی کے نزدیک دنیا میں استبداد کے دروازے اور دوسروں کو غلام بنانے کے ذرائع۔ یعنی ملوکیت کی نت نئی سامانیاں اور مذہبی پیشوائیت کی ابلہ فریبیاں!

---

[1] توحید خالص سے مراد ہے ایک اور صرف ایک خدا کے احکام و قوانین کی اطاعت۔ (طلوعِ اسلام)

سادگی و پُرکاری

مودودی صاحب کے نزدیک، اسلام نے جو معاشی نظام دیا ہے، اس کی تفصیل انہوں نے اپنی کتاب ۔۔ مسئلہ ملکیت زمین ۔۔ میں دی ہے۔ وہ اس سوال کے جواب میں کہ زمین پر ملکیت کے رقبہ کی حد بندی کی جاسکتی ہے یا نہیں، لکھتے ہیں۔

۱۔ اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زاید ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے؛

(مسئلہ ملکیت زمین۔ ص ۵۲-۵۳)

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے (NATIONALISATION) کے متعلق رقمطراز ہیں۔

۲۔ سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ، اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے

> کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن واجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقہ سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دیکر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا ورغبت خرید لے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیاتِ شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو مگر کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی تصور، اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

دونوں اصول بالکل واضح ہیں۔ یعنی (۱) زمین کی ملکیت کے سلسلہ میں کوئی حدبندی نہیں کی جا سکتی۔ اور (۲) قومیانے سے ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ مودودی صاحب نے اپنی کتاب (مسئلہ ملکیت زمین) ۱۹۵۰ء میں شائع کی تھی اور اس کے بعد آج تک وہ ہر اس تجویز کی شدت سے مخالفت کرتے رہے جس میں زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی کی سفارش کی گئی ہو یا کسی کارخانوں وغیرہ کو قومی ملکیت میں لے لینے کا سوال اٹھایا گیا ہو۔ یہ چیزیں نظامِ سرمایہ داری میں کبھی گوارا نہیں کی جا سکتیں۔

لیکن زمانے کے تقاضے انسان کو مار مار کر صحیح راستے کی طرف لے آتے ہیں۔ اب جو سرمایہ داری کے خلاف دنیا بھر میں طوفانِ مخالفت برپا ہوا تو جماعتِ اسلامی کو بھی اپنی روش میں تبدیلی کرنی پڑی۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ تبدیلی کیا ہے۔ غور سے سنئے۔ پچھلے دنوں جماعتِ اسلامی کی مجلسِ عاملہ نے ایک قرارداد پاس کی ہے جس میں کہا

گیا ہے کہ

(۱) قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد (مثلاً سو یا دو سو ایکڑ) تک محدود کر دیا جائے۔ اور اس سے زائد ملکیت کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے۔ اور

(۲) جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی ہاتھوں میں چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے ان کو قومی انتظام میں چلایا جائے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت اپریل ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۲۰٫۱۲۱)

آپ جب اس قرارداد کا حب اترہ "مسئلہ ملکیت زمین" کے مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں لینگے تو انگشت بدنداں رہ جائینگے کہ اس قدر باہمدگر متضاد اصول کس طرح ایک ہی اسلام کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں اصول "اسلامی" ہیں۔ چنانچہ ترجمان القرآن (بابت اپریل ۱۹۶۹ء) میں یہ قرارداد حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

[ذیل میں مجلس عاملہ جماعت اسلامی کی وہ قرارداد درج کی جا رہی ہے جس میں وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جن کی بنیاد پر ملک کے موجودہ معاشی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس قرارداد کو دیکھ کر ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جب ہم اسلام کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے ان مسائل کو حل کر سکتے ہیں تو ہمیں باہر سے کوئی نظریہ اور نظام درآمد کرنے کی کیا حاجت ہے؟ اور اس بات کی آخر کیا ضرورت ہے کہ جو اصلاحات ہم اپنے معاشی نظام میں بالکل اسلامی اصولوں کی بنیاد پر کر سکتے ہوں انہیں خواہ مخواہ "اسلامی سوشلزم" کے نام سے موسوم کیا جائے؟ اس غلط اصطلاح سے تو لامحالہ یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اسلام میں کوئی نقص تھا جسے دور کرنے کے لئے ہمیں سوشلزم کا پیوند لگانے کی ضرورت پیش آئی۔] (ترجمان القرآن صفحہ ۱۲۰)

بالکل بجا! جب (مسئلہ ملکیت زمین والے) اسلام میں حد بندی ممنوع ہے اور قومیانہ شیطان کی ایجاد تو ہمیں نظام سرمایہ داری سے شرمانے کی کیا ضرورت ہے اور جب (قرارداد والے) اسلام میں حد بندی اور قومیانے کی اجازت ہے تو ہمیں "اسلامی سوشلزم" کو اپنانے کی کیا حاجت ہے؟

آپ یقیناً حیران ہونگے کہ جماعت اسلامی نے ایسی باہمدگر متضاد باتیں کس طرح عین مطابق اسلام قرار دے دیں؟ سنیئے کہ یہ انہوں نے کیسے کیا ہے؟ مذکورہ صدر قرارداد میں کہا گیا ہے۔

ایک طویل مدت تک زرعی املاک کے معاملہ میں غلط نظام رائج رہنے کی وجہ سے جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو ختم کرنے کے لئے شریعت کے اس قاعدے پر عمل کیا جائے کہ

> غیر معمولی حالات میں غیر معمولی تدابیرِ اصلاح اختیار کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۳)

آپ سردست اس سوال کو چھوڑ دیجیئے کہ "مسئلہ ملکیت زمین" میں حدبندی اور توریث کے خلاف جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اصولِ دین تھے یا نہیں اور موجودہ قرارداد ان اصولوں سے متصادم ہوتی ہے یا نہیں۔ اور اس سوال کو بھی نہ اٹھایئے کہ "مسئلہ ملکیت زمین" کی اشاعت (بلکہ پچھلے چند ماہ) کے بعد وہ کون سے غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے ہیں[1] جن کے پیشِ نظر جماعتِ اسلامی کی شریعت کو اس قسم کی غیر معمولی اصلاحات کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے۔ اور یہ بھی دریافت نہ کیجئے کہ اس امر کے فیصلہ کرنے کا حق کسے حاصل ہے کہ ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو چکے ہیں جن میں غیر معمولی تدابیرِ اصلاح اختیار کی جاسکتی ہیں۔ دیکھیئے صرف یہ کہ اس قرارداد کے بعد بھی پھر سے نظامِ سرمایہ داری کی طرف پلٹ جانے کی کس طرح گنجائش رکھ لی گئی ہے۔ رقبہ کی تحدید سے متعلق قرارداد میں کہا گیا ہے۔

> یہ تحدید صرف عارضی طور پر پچھلی ناہمواریاں دور کرنے کے لئے کی جاسکتی ہے۔ اسے مستقل حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ مستقل تحدید صرف اسلامی قانونِ وراثت ہی سے نہیں بلکہ متعدد دوسرے شرعی قوانین سے بھی متصادم ہو جائے گی۔
>
> (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۳)

کچھ سمجھے آپ کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اصول "صرف آئندہ الیکشن میں" سوشلزم کے حامیوں کے خلاف ووٹ حاصل کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ جب الیکشن کے بعد اپنی حکومت قائم ہو جائے گی، (جس کے خواب یہ حضرات گذشتہ بیس سال سے دیکھ رہے ہیں) تو پھر غیر معمولی حالات ختم ہو جائیں گے اور وہی قدیم سرمایہ دارانہ نظام بدستور نافذ رہیگا۔

(۲)

لیکن اس سے بھی اہم سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر غیر معمولی حالات سے نپٹنے کے لئے ان اصولوں میں تبدیلی کی جاسکتی تھی تو "مسئلہ ملکیت زمین" میں اس کی صراحت کیوں نہ کر دی گئی۔ اس سے تو مودودی صاحب پر گرفت کی جاسکتی ہے کہ وہ خود اپنے پیش کردہ اصولوں کے خلاف جا رہے ہیں۔

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ سوشلزم کا بھوت ہے جو ان حضرات کے اعصاب پر سوار ہو رہا ہے اور جس کے دفعیہ کے لئے اس قسم کے جھاڑ پھونک تجویز کئے جا رہے ہیں۔

لیکن آپ بہت بھولے واقع ہوتے ہیں۔ وہ شاطر ہی کیا جو اس طرح آسانی سے مات کھا جائے۔ مودودی صاحب نے یہ "گُھر" پہلے سے روک لئے ہیں۔ یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔

مودودی صاحب کی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ ہم نے جو اقتباسات اوپر درج کئے ہیں وہ اسی ایڈیشن کے ہیں۔ اس کے بعد جب جماعت اسلامی کے افراد مودودی صاحب کے اس کھلے نظامِ سرمایہ داری سے شرمانے لجانے لگے تو یہ کتاب مارکیٹ سے ناپید ہو گئی اور (خریدنے کو ایک طرف) یہ کہیں سے دیکھنے کو بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکن مارچ ۱۹۶۹ء کے ترجمان القرآن کے ٹائیٹل پر یکایک یہ اشتہار سامنے آگیا۔

اسلام کے معاشی نظام پر۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کی "تازہ تصنیفات" کا مطالعہ کیجئے!

اور ان تازہ تصنیفات میں، پہلا نمبر "مسئلہ ملکیت زمین" کا تھا۔

ہم نے اس کتاب کو حاصل کیا۔ اس کے شروع میں "اشاعت" کے تابع صرف اتنا لکھا ہے۔ اوّل ۱۹۵۰ء، دوم ۱۹۵۵ء، سوم مارچ ۱۹۶۹ء۔ اس کے بعد کہیں ایک لفظ بھی اس بارے میں نہیں آیا کہ اس پر مصنف نے نظرثانی کی ہے یا اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے شروع میں دیباچہ بھی وہی طبع اول کا ہے جس پر (۲۹ جنوری ۱۹۵۰ء) کی تاریخ درج ہے۔ یعنی تاثر یہ دیا گیا ہے کہ یہ ایڈیشن ۱۹۵۰ء کے ایڈیشن کا (RE - PRINT) ہے اور بس۔ لیکن کتاب کے اندر متعدد تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ان میں اہم تبدیلیاں وہ ہیں جو مندرجہ بالا قرارداد کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ مثلاً ہم نے "مسئلہ ملکیت زمین" (۱۹۵۰ء ایڈیشن) سے جو اقتباس نقل کیا ہے نئے ایڈیشن میں اس عبارت پر نشان لگا کر نیچے یہ فٹ نوٹ دیا گیا ہے۔

> اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام کا اصولی قانون تو یہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے۔ البتہ کسی خاص حالت میں بہ ضرورت محسوس ہو کہ زمین کی زیادہ سے زیادہ ملکیت کے لئے مقدار کی ایک حد مقرر کی جائے تو عارضی طور پر اتنی مدت کے لئے ایسا کیا جا سکتا ہے جب تک وہ ضرورت باقی رہے۔ لیکن اس طرح کے کسی فیصلے سے اسلام کے اصولی قانون میں کوئی مستقل ترمیم نہیں ہو سکتی۔ آگے چل کر ہم اس مسئلے پر مفصل بحث کر رہے ہیں۔

(مسئلہ ملکیت زمین ۱۹۶۹ء ایڈیشن - صفحہ ۷۸)

آگے چل کر صفحہ ۱۱۱ پر یہ نئی عبارت ملتی ہے۔

اس حالت میں شرعاً یہ درست ہو گا کہ ایک عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت کی ایک حد مقرر کر

> دیجائے اور اس حد سے زائد جو رقبے لوگوں کے پاس ہوں ان کو ایک منصفانہ شرح سے خرید کر آگے غیر مالک کاشتکاروں کے ہاتھ منصفانہ شرح پر فروخت کر دیا جائے۔ لیکن یہ حدبندی نہ تو دائمی ہو سکتی ہے، کیونکہ اسے شریعت کے بہت سے قواعد کو بدلے بغیر مستقل بنانا ممکن نہیں ہے، اور نہ اس کو دائمی قانون بنا دینے کی کوئی ضرورت ہے۔ کیونکہ آئندہ کے لئے اگر اسلام ملک کا قانون ہو اور اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے تو سرے سے وہ خرابیاں ہی پیدا نہیں ہو سکتیں جن کے لئے ایسی حدبندی کی کوئی ضرورت ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ بساطِ سیاست کے ان شاطران نے پہلے ہی سے وہ "گھر" کیسے روک لئے جن سے آپ انہیں مات دینا چاہتے تھے۔ اب ہوگا یہ کہ جب آپ طلوعِ اسلام میں شائع شدہ "مسئلہ ملکیتِ زمین" کے اقتباسات پیش کریں گے تو یہ حضرات نہایت بیباکی سے کہہ دیں گے کہ یہ تو طلوعِ اسلام والوں کی قدیم روش ہے کہ وہ ہمیشہ نامکمل اقتباسات درج کرتے ہیں۔ یہ ہے ہمارے ہاتھ میں "مسئلہ ملکیتِ زمین" (یعنی اس کا نیا ایڈیشن)۔ دیکھئے اس میں پوری عبارت کیا ہے؟ اور اس کے بعد وہ ان اضافوں کو سامنے لے آئیں گے جو نہایت چابک دستی سے نئے ایڈیشن میں درج کر دیئے گئے ہیں اور اس کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا کہ پہلے ایڈیشن میں یہ عبارات نہیں تھیں۔

یہ ہے عصرِ حاضر کے "مصلحین" کی سادگی و پُرکاری کی ایک مثال۔ جو "اسلامی نظام" ان کے ہاتھوں سے متشکل ہوگا، اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار کی صبح ۔ آٹھ بجے
۲۵/بی ۔ گلبرگ (۲) لاہور

کراچی میں
ہر اتوار کی صبح ۔ ۹ بجے
(بذریعہ ٹیپ)
سیمینار ہال ۔ سندھ اسمبلی بلڈنگ

اسلامی نظریۂ قومیت

ایک غیر مسلم کی شہادت

قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کا اعلان کیا کہ انسانوں کی تقسیم نسل، زبان، وطن، رنگ وغیرہ کی تفریق کی بنا پر نہیں، بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک کے معیار کے مطابق کی جائے گی ۔۔۔ وحی کی رو سے عطا کردہ نظریۂ زندگی پر ایمان رکھنے والے، ایک قوم کے افراد اور اس سے انکار کرنے والے دوسری قوم سے متعلق، خواہ وہ ایک ہی نسل کے افراد ہوں اور ایک ہی وطن میں کیوں نہ بستے ہوں۔ تشکیلِ قومیت کے اس اصول کے بعد اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ تمام انسانوں سے (بلا لحاظ آئیڈیالوجی) عدل و انصاف کا سلوک کرنا چاہیئے۔ لیکن مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اپنے اجتماعی امور میں غیر مسلموں کو اپنا رازداں بنائیں۔ اس نے کہا کہ یاد رکھو! غیر مسلم تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری کامیابی پر جل بھن اٹھیں گے اور تمہاری تباہی پر بہت خوش ہوں گے (۳/۱۱۸)۔ اس نے یہ اصول دیئے اور انکی بنیاد پر ایک امت تشکیل کی۔ لیکن بعد میں مسلمانوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا۔

صدیوں کے بعد، اس حقیقت کا اعلان، آج سے قریب سو سال پہلے سرسید نے کیا جب کہا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ انہیں ایک قوم فرض کر لینا حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ سرسید کے بعد اسی دعوت کو لے کر اقبال اٹھے اور ساری عمر اس کا پرچار کرتے رہے کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور یہ کہ ۔۔۔ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ۔۔۔ اسی قرآنی آواز کو عملی شکل دینے کے لئے قائدِ اعظمؒ آگے بڑھے اور نہایت واضح الفاظ میں اپنے اس دعویٰ کو پیش کر دیا کہ چونکہ مسلمان، اپنے دین کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں اس لئے ان کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔ ہندو اس اعلان سے تلملا اٹھا۔ چنانچہ (مہاتما) گاندھی پکار اٹھا کہ

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب

> چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں (گاندھی کا خط بنام جناح۔ مورخہ ۱۵/۹/۴۴ء)

اور یہ کہ

> میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۴/۴/۴۴)

—— ہندو نے تو اس نظریہ کی مخالفت کرنی ہی تھی کیونکہ وہ جو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا، اس نظریہ کی رو سے وہ خواب "خوابِ پریشان" بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن حیرت اس پر تھی کہ خود مسلمانوں کی ایک جماعت بھی اس نظریہ کی مخالف ہو گئی اور انہوں نے ہندوؤں کی ہمنوائی میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کے باشندے ہونے کی بنا پر، ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم کے افراد ہیں، اور قیامت بالائے قیامت کہ اس یکسر غیر اسلامی نظریہ کے حامل (زیادہ تر) نیشنلسٹ علماء کی جماعت تھی جس میں (مولانا) ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، احمد سعید دہلوی، حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ اکابر علماء شامل تھے اور جوش ملیح آبادی جیسے قلمکار ہندو نوازی کے جوش میں یہاں تک کہہ گئے کہ

> اپنے آپ کو مسلم یا ہندو کہنے اور ہندوستانی بعد میں کہنا جغرافی صداقت اور فطری قانون کے خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلا کیسی؟ قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔ (یکم دسمبر ۱۹۳۷ء)

لیکن قائداعظمؒ کی جدوجہد نے مخالفین کے لئے اس دعویٰ کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہا اور انگریز، ہندو اور خود قوم پرست مسلمانوں کی مذموم کوششوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا۔

مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی بنا پر تقسیمِ ملک کو بیس برس سے زائد کا عرصہ گذر گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس بیس سال کے تجربہ نے متحدہ قومیت کے حامیوں کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے۔ کیا اس نتیجہ پر کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کے باشندے ہونے کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں؟ یا مسلمان اپنے دین اور کلچر کی بنا پر، ہندوستان کے باشندے ہونے کے باوجود، ہندوؤں سے الگ، ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں! اس سوال کے جواب کے لئے، ہم

قارئین کی خدمت میں ایک ہندو صاحبِ فکر و قلم کا ایک مقالہ پیش کرتے ہیں جسے انہوں نے سالِ گزشتہ اس زمانے میں شائع کیا تھا جب وہاں ہندو مسلم فسادات اپنی شدت تک پہنچ چکے تھے۔ یہ صاحبِ قلم ہیں مسٹر نراد سی چودھری (NIRAD C. CHAUDHURI) جن کے مقالات اور مستقل تصنیف (THE CONTINENT OF CIRCE) نے ہندوستان میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ ان کا یہ مقالہ ہم (اہلِ پاکستان) کے لئے بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے کہ (بدقسمتی سے) ہمارے ہاں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دماغ میں یہ جرثیم بدستور پرورش پا رہے ہیں کہ نیشنلسٹ علماء اور دیگر لیڈر اپنے اس دعویٰ میں سچے تھے کہ ہندو اور مسلمان اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں اور قومیت کی تشکیل آئیڈیالوجی کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ ہم اس مقالہ کو اسی اہمیت کے پیشِ نظر شائع کر رہے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

مسٹر چودھری کا مقالہ

"ہندوستان میں ہونے والے حالیہ ہندو مسلم فسادات کے بعد میرے اپنے اس ملک کا جو تصور میرے اپنے ذہن میں ابھر کر آیا ہے وہ بہت اندوہناک اور ڈراؤنا ہے۔ ہندو مسلم تعلقات پر میں گزشتہ چالیس برس سے لکھتا آ رہا ہوں اور ابھی زیادہ دن نہیں گزرے جب میں نے اس کے حالیہ رخ پر روشنی ڈالی تھی۔

میری زیادہ تر توجہ اس کشمکش کی اصلیت جاننے کی طرف تھی میں نے اس کشمکش کے حل کے لئے کوئی تجویز نہیں پیش کی تھی۔ مجھ سے بار بار یہ سوال کیا گیا کہ آیا اس کشمکش سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے یا نہیں اور مجھے افسوس ہے کہ ہر مرتبہ جواب یہی تھا کہ کم سے کم مجھے کوئی حل نظر نہیں آتا۔

حالیہ فسادات کے بعد یہ تحریک شروع ہوئی کہ کوشش کر دیکھو شاید تم کوئی حل پیش کر سکو۔ اس پس منظر میں مسٹر ارشد حسین پاکستانی وزیرِ خارجہ کا یہ بیان بھی میرے ذہن میں آیا کہ پاکستان ہندوستان میں ہونے والے مسلسل فرقہ وارانہ فسادات سے آنکھیں بند کر کے نہیں رہ سکتا۔ اسے ان کے خلاف مؤثر اقدام کرنا ہی ہوگا۔ اخباری نامہ نگار نے یہ بھی اشارہ دیا تھا کہ اس مسئلہ کو شاید اقوامِ متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کے روبرو پیش کر دیا جائے اور ہندوستان پر نسل کشی کا الزام رکھا جائے۔

لیکن کیا یہ واقعی درست ہے کہ عقلی تشخیص کے بعد بھی اس مسئلہ کا کوئی علاج تجویز ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر عقلی تشخیص صرف منطق کی اگر مگر کا نام ہے تو ہندو مسلم کشمکش کے کئی حل بنا لینا کوئی مشکل نہیں اور ایسے لاتعداد حل بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔ مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ بڑے پس و پیش کے بعد حکومتِ ہند بھی ایک منفی تشخیص تک پہنچ گئی ہے اور وہ ہے قومی یک جہتی کونسل کے احیاء کی جس کا اجلاس ۲۰ جون کو سری نگر میں ہوا تھا۔

اس سلسلے میں وزارت داخلہ نے جو قرطاس ابیض شائع کیا ہے اس کے اندر اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ صرف انتظامی اور قانونی اقدامات سے ہی فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلے سے نہیں نمٹا جا سکتا۔ ذرا اس نکتہ کی داد دیتے چلئے۔

اس کے مقابلہ میں خود میرا ایک نقطۂ نظر ہے اور میں اپنے قارئین سے اپیل کروں گا کہ وہ ذرا اس پر بھی دھیان دیں۔ میرا خیال ہے کہ مسئلہ کے حل کے لئے یہ نقطۂ نظر نہ صرف بنیادی اہمیت رکھتا ہے بلکہ حل تلاش کرنے کی کوشش بھی اس کے بغیر فضول ہے۔

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب دوبارہ کھل کر پورے شد و مد سے مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ۔

جب تک ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے ہندو یہی رٹ لگاتے رہیں گے کہ یہاں کے مسلمان ایک متحدہ قومیت کا جز ہیں، جن کی تہذیب و ثقافت، جن کے سماجی ادارے اور جن کا ذہنی نقطۂ نظر وہی ہے جو اس متحدہ قومیت کا ہے، اس وقت تک اس مسئلہ کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ حل نکالنا تو دور کی بات رہی، امر واقعہ یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ حلقے ہیں جو دو مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اور ان کے اندر یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے اور رہے گا۔

قومی تحریک آزادی کے ابتدائی دنوں سے ہی یہ "ایک قومی" نظریہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کو بگاڑتا چلا آ رہا ہے۔ تحریک آزادی کے اولین دور میں جب مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت کی دعوت عام دی گئی تو مسلمان لیڈروں نے اس دعوت کو رد کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنی قسمت اکثریت کے پہیے سے باندھ دی تو اس کا صرف ایک ہی انجام ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اس پہیے کی گردش میں یہ بھی اس طرح لپیٹ میں آ جائینگے کہ ان کی علیحدہ قومیت کا نام و نشان باقی نہیں رہ سکیگا اور وہ کچل کر رہ جائینگے۔ اس مسئلہ کا اصل جزو ہمیشہ سے یہی بات رہی ہے۔

نہ مسلمان اپنے اس مقام سے پیچھے ہٹے اور نہ ہندو آگے بڑھ کر اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہوئے۔

اگر اب بھی وہ یہی رٹ لگائے چلا جائے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی قوم کا جز ہیں تو عملی حل تو دور کی بات رہی، مسئلہ کو سمجھنا ہی ناممکن اور ایک لاحاصل کوشش ہے۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہندوستان کی سیاسی تنظیم کے لئے متحدہ قومیت (نیشنلزم) کو بنیاد ہی کیوں بنایا جائے خواہ مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا ہو یا ریاستوں (اور ان کے لفظوں میں صوبوں) اور مرکز کے روابط کا یا کوئی اور۔ یہ بنیاد ہی غلط ہے اس لئے کہ خود جزائر برطانیہ کی متحدہ قومیت اسکاٹش اور ویلش قومیتوں کے عروج کے بعد مایہ النزاع بن گئی ہے۔ (ذرا برطانیہ اور ہندوستان کے رقبوں کا مقابلہ تو کیجئے۔ برطانیہ میں

لوگ تین قومیتوں کا شور مچا رہے ہیں جب کہ اس کا طول و عرض ہمارے چھوٹے صوبے سے بھی کم ہے اور آئرلینڈ والے تو پہلے ہی الگ ہو چکے ہیں اور یہاں اتنے بڑے ملک کے لئے زبردستی متحدہ قومیت تھوپی جا رہی ہے۔

بے چارا آئرلینڈ تو پہلے ہی متحدہ برطانوی قومیت سے عاجز آ کر ایک خونی بغاوت کے بعد مکمل آزادی حاصل کر چکا ہے اور برطانوی قومی ریاست میں ہر اسے نام بھی شریک رہنا اسے گوارا نہیں۔ اسکاٹ لینڈ اور ویلز کے لوگ بھی اب اپنے لئے اسی حیثیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

بی بی سی لندن نے ان قومی تحریکوں کو کافی اہمیت دی ہے اور ابھی حال ہی میں اس کے ٹیلی ویژن پروگرام میں ایک طویل اور دلچسپ مذاکرہ ہوا تھا جس میں ہر مکتب فکر کے لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔ اس میں سرکاری اور غیر سرکاری ہر طرح کے لوگ تھے۔ اسکاٹ لینڈ کی قومیت (برطانیہ سے جداگانہ قومیت) کے ایک پُرجوش حامی کی زبان سے میں یہ سنکر حیران رہ گیا۔

تم (مراد برطانیہ کے لوگ) نے کسی کے دعوے پر کان ہی کب دھرے ہیں جب تک کہ تمہیں اس کے لئے کیلئے مجبور نہیں کر دیا گیا۔ تم نے یہ طرز عمل آئرلینڈ کے ساتھ اختیار کیا۔ یہی ہندوستان، قبرص اور کینیا جیسے ممالک کے ساتھ کیا۔

اس پروگرام میں جو ہر مکتب فکر کی نمائندگی کرنے والوں پر مشتمل تھا لوگوں سے اسکاٹ لینڈ کی آزادی کی حمایت یا مخالفت میں ووٹ دینے کو کہا گیا اور نتیجہ بہت حیرت انگیز تھا۔ ۷۵ فیصد رائیں اسکاٹ لینڈ کو انگلینڈ سے آزاد کر دینے کے حق میں آئی تھیں۔ ویلز کا مسئلہ اتنی شدت سے نہیں اٹھا۔ لیکن اس کی آزادی کی بھی حمایت کی گئی۔

بی بی سی نے اس پروگرام کا عنوان ہی "ٹوٹا پھوٹا انگلینڈ" رکھا تھا اور ایک ایسا نقشہ دکھایا گیا تھا جس میں جزائر برطانیہ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے منتشر دکھائے گئے تھے۔

اگر برطانیہ جیسے متحد اور ہم خیال ملک کا یہ حال ہو سکتا ہے تو ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے جو صدیوں سے مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ کا مقام رہا ہے ایک متحدہ غیر منقسم قومیت کا تصور کم سے کم دو ہزار سال تک فرسودہ ہے۔

میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ ہندوستان میں جہاں تک تاریخی ثبوت فراہم ہو سکے ہیں سیاسی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے سب سے زیادہ متحد اور غیر منقسم دور یہ دور میں تھا۔ اس سے پہلے کیا حال تھا۔ اس کے بارے میں ہم پورے وثوق سے کچھ نہیں جانتے۔

جہاں تک موریہ دور کے بعد کا حال ہے ہندوستان میں تہذیبی لحاظ سے اور علیحدگی پسندی کے تصورات کی بنیاد پر تنوع بڑھتا چلا گیا۔ مختلف تہذیبیں یہاں آتی رہیں اور انکے ماننے والے گروپ اپنی اپنی جگہ سختی سے ڈٹے رہے۔ دوسروں سے مل جانے پر کبھی تیار نہیں ہوئے۔

اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا تاریخ کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اور ہندوستان کی تاریخ کے تمام طالب کو جھٹلانا ہے۔

تاریخ کچھ چیزوں کو ناممکن بنا دیتی ہے اور جس طرح کے ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دی جا رہی ہے وہ بھی ان ہی ناممکنات میں سے ایک ہے۔

اگر میری یہ بات مان لی جائے تو پھر اگلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ یہ کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں اور مسلمان ایک علیحدہ معاشرے کی حیثیت سے صرف اسکے خواہشمند ہیں کہ انہیں ہندو مساوی حیثیت دیں یا ماننے کے بعد تمام ہندوؤں کو مصمم فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ انہیں اقلیتی فرقے کے شبہات کے ازالہ کے لئے جلد از جلد جو کچھ بھی ممکن ہو کرنا چاہیئے الا یہ کہ ہندوؤں نے یہ طے کر لیا ہو کہ وہ دوسرے فرقہ کا نام و نشان مٹا دیں گے۔

یہ شبہات حقیقی ہیں۔ اقلیتی فرقے کی داخلی کمزوریوں یا پھر ناتوانیوں کو دور کرنے کے لیے بھی کچھ ضرور ہی کرنا پڑیگا۔

یہ بات یقینی ہے جس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کا ایک علیحدہ وجود ہے خواہ ان کی آئینی اور قانونی حیثیت کچھ بھی ہو۔ آج اگر کوئی یہ مطالبہ کرے کہ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں مسلمانوں کے لئے سیٹیں متعین ہونی چاہئیں، تو ہر طرف سے یہ شور مچے گا کہ یہ مطالبہ بے جا ہے۔ کیونکہ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کے آئی اے ایس میں داخلہ پر تو حکومت یا اکثریتی فرقے نے کوئی پابندی نہیں عاید کی ہے لیکن اس طرح کے سارے دلائل مل کر بھی اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ رنگ، تہذیب اور ذہنی نوعیتیں ہی بہت سے امتیازات پیدا کر دیتی ہیں۔ دوسرے اختلافات مذہب، زبان، ملک وغیرہ تو دور رہنے دیجئے۔

امریکہ میں رنگ و نسل کے امتیاز کے خلاف تمام مذمتوں نے مل کر بھی اب تک سفید فام اور نیگرو باشندوں کے درمیان کشمکش کی شدت میں ذرہ برابر کمی نہیں کی ہے بلکہ حالیہ مہینوں میں یہ کہیں بڑھ گئی ہے۔

امریکہ میں رنگ کے امتیاز کو ختم کرنے کے لئے بہت سی تدبیریں اپنائی جا رہی ہیں لیکن مجھے اخبار میں یہ رپورٹ دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ امریکہ میں ایسی گولیوں کا تجربہ کیا جا رہا ہے جو ایک نیگرو کو سفید فام بنا سکتی ہے۔ اس گولی کے موجد کا کہنا تھا کہ اسکے اعلان کے وقت تک ۵ لاکھ نیگرو سفید فام بن چکے ہیں۔ اس گولی کے ماہرین میں سے ایک نے دعویٰ کیا کہ اس گولی سے ایک سیاہ فام نیگرو کم عمر لڑکی اتنی سفید فام بن گئی کہ اسے سفید فام دہشت پسندوں کی تنظیم کو کلکس کلان نے اپنا ممبر بننے کی دعوت دی۔

انسانوں نے اپنی دوستی اور منافرت کی جو سوٹیاں بنا رکھی ہیں ان کو نظر انداز کر دینے کی حماقت کا اس سفید بنا دینے والی گولی سے زیادہ اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

کیا ہندو ماہرین عضویات ایک ایسی گولی تیار کرنے میں کامیاب ہو جائینگے جو اگر کوئی مسلمان کھالے تو وہ ہندوؤں کی طرح محسوس اور عمل کرنے لگے۔ ہندو مسلم اختلافات کا جتنا شور مچایا جا رہا ہے اس سے میرے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ کہیں ہم بھی کسی ایسی گولی کے بنانے میں یقین نہ کرنے لگیں۔

(بقیہ)

خورشید عالم

استعمار کا عالمی کردار (۳)

اس عنوان کے تحت فروری اور مئی میں یہ جائزہ لیا جا چکا ہے کہ استعمار نے کس بے دردی سے مغلوب اقوام کو لوٹا اور ان کے اثاثے قومی کو تباہ کیا۔ اس نشست میں ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ آزادی کے بعد ان اقوام سے کیا سلوک روا رکھا گیا اور روا رکھا جا رہا ہے۔ جیسے کہ لکھا جا چکا ہے ان ممالک سے آزاد مستقبل کے متعلق تو خوشنما وعدے کئے جاتے رہے لیکن بڑی عیاری سے ان کے شعور کی بنیادوں میں یہ بات پہنچائی اور بٹھائی جاتی رہی کہ وہ ایسے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں کہ استعمار کی پشت پناہی ان کے لئے ناگزیر ہے۔ نیز اسی کے سایۂ عاطفت میں اور نظرِ کرم سے وہ اس سطحِ شعور تک پہنچ سکیں گے جو آزادی کا پیش خیمہ بھی ہے اور لازمہ بھی۔ استعمار کے برگد کی گھنیری چھاؤں میں یہ قومیں ایک عرصۂ حیات، قومی کی قوتِ نمو کی بے سود آزمائش کرتی رہیں۔ ان کی بالیدہ اور بارآور ہونے کی صلاحیت برگد ہی کو پروان چڑھانے کے کام آتی رہی۔ استعمار کا یہ برگد ان کے حصے کی زمینی رطوبت اور آسمانی حرارت بلا شرکتِ غیرے ہضم کرجاتا رہا۔ ان نازک پودوں کی سوکھی رگیں برسوں، صدیوں برگد کا منہ دیکھتی رہیں۔ آخر کار ان میں ایسا طوفانِ حیات آیا کہ زمین کا سینہ شق ہونے لگا، سورج کی کرنیں تڑپ کر ان تک پہنچنے لگیں اور برگد لرزنے لگا۔ برگد نے کہنے کو پودوں کا حقِ زیست تسلیم کرلیا لیکن وہ ان کے پھیلاؤ کے لئے اپنی بچی کھچی جگہ سے زیادہ رعایت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ استعمار نے اس کا انتظام شروع ہی سے کیا کہ غلام قومیں سر اٹھائیں تو ایک حد سے تجاوز نہ کرسکیں۔ جہاں ایسی صورت نظر آئی وہاں بغاوت کا ڈھنڈورا پیٹ کر اسے سختی سے کچل دینے میں کوئی کمی نہ رہنے دی گئی۔ پیش بندی کے طور پر آزادی کی تحریکوں کی خود طرح ڈالی گئی اور اپنی رہنمائی میں انہیں معین منزل تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً برصغیر میں مسلمانوں کی جد وجہد اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ حریت کو پوری قوت سے دبایا گیا اور غایت قساوتِ قلبی سے سرفروشانِ آزادی اور ان کے مراکز کو تاراخت کیا گیا۔ لیکن آگے چل کے کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اور اس کی جد وجہد کو نشان زدہ راستے پر

ڈال دیا گیا۔ اس خود کاشتہ پودے کے متعلق یہ دوہرا اطمینان تھا کہ وہ برگد سے کم سے کم اُلجھے گا اور اپنی خوراک اس شاخِ حریت سے چھینے گا جو مسلمانوں کے اذہان کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نشو و نما کی یقینی منزلیں طے کرتی دکھائی دیتی تھی۔ ایک حد تک اسی کا نتیجہ ہے کہ گو پچھلی صدی میں مجاہدین اور اس صدی میں دہشت پسند استعمار سے براہِ راست ٹکرائے تاہم مجموعی اعتبار سے آزادی کی تحریک آئینی سرگرمیوں کی رہی۔

اس میں برصغیر ہی کی تخصیص نہیں جہاں کہیں بھی براہِ راست تصادم کی نوبت آئی استعمار نے درندگی کا مظاہرہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور کئی جگہوں پر اس وقت تک دستبردار ہونے کا نام نہیں لیا جب تک اپنی پسند کے مقامی جانشین اسے نہیں مل گئے۔ پسند کے جانشینوں سے وہ بھی مراد لئے جا سکتے ہیں جو استعمار کے نامزدگان تھے اور وہ بھی جو استعمار کے تو خلاف تھے لیکن ان سے توقع کی جا سکتی تھی کہ آزادی کے بعد استعمار کا رائج کردہ نظمِ سیاسی برقرار رکھیں گے اور استعماری آقا کو اپنا حلیف سمجھیں گے۔ اکثر و بیشتر ایشیائی اور افریقی آزاد ممالک میں ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ جو ممالک آزاد ہوئے ان میں یہ فرق تو پڑا کہ غیر ملکی حکمران رخصت ہو گئے لیکن طرزِ حکومت پہلے کی طرح استبداد اور استحصال ہی پر مبنی رہا۔ اس سے اسی کشمکش کا پیدا ہو جانا بلکہ جاری رہنا ناگزیر تھا جو استعمار کی موجودگی میں قابلِ فہم طور پر پیدا ہو گئی تھی۔ جب تک آزادی کا ابتدائی نشہ باقی رہا اندرونِ ملک اس کشمکش کو ناخوشگوار سمجھا نہ جا سکا اور اس سے ایک حد تک آنکھیں بند رکھی گئیں۔ کیونکہ گمان یہ کر لیا گیا تھا کہ غیر ملکی حکمرانوں کے چلے جانے سے خود بخود وہ مفاسد ختم ہو جائیں گے جن سے عمومی ہیجان و اضطراب کی پریشان کن صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ گویا سادہ لوحی کی حد تک یہ سمجھا کہ ان کا مسئلہ خالصۃً سیاسی ہے اور استعماری حکمرانوں کے بعد سیاست کے بعد ان کی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا اور سامراج کے ملک الموت نے ان کی جو روح قبض کر رکھی تھی وہ پھر قومی جسد میں پھر سے جاری و ساری ہو جائے گی۔ ایسا کہیں بھی نہ ہو سکا اور ہر نو آزاد ملک میں سیاسی ہیجان بڑھتے گئے اور معاشی پریشانیاں سر اٹھانے لگیں۔ ان ممالک کے لئے یہ حیرت کا مقام تھا کہ استعمار کے رخصت ہو جانے کے باوجود ان کا دورِ ابتلا کیوں ختم نہ ہوا۔ وہ ابھی اس راز تک نہیں پہنچ پائی تھیں کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ حکومت کی مسندوں پر غیر ملکیوں کی بجائے ملکی قابض ہو جائیں بلکہ نظمِ عمرانی کی ایسی تشکیلِ نو کی جائے جو افرادِ قوم میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تمیز روا نہ رکھے اور ہر ایک کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر اجتماعی فلاح و بہبود میں اضافہ کرنے اور کرتے رہنے کا پورا پورا موقع مہیا کرے اور کئے رکھے۔

استعمار نے رخصت ہو جانے کے بعد انتہائی کوشش کی کہ اس کی آزاد کردہ قوموں پر یہ رمزِ عمرانی آشکارا نہ ہو جائے۔ اس نے خلفشار کی حد تک پہنچتے ہوئے ہیجان و اضطراب کو دیکھا تو ناصحانہ ہمدردی سے انہیں باور کرایا کہ انہیں فیاضانہ کرم گستری کے تحت آزادی دے دی گئی تھی ورنہ وہ کاروبارِ حکومت چلانے کے اہل نہیں اور

ابھی انہیں مطلوبہ اہلیت پیدا کرنے کے لئے تجربہ کار استعماری ملک کی نگرانی میں طویل عرصہ امیدواری گزارنے کی ضرورت ہے۔ ان کے دل میں یہ بات بٹھائی گئی کہ اندرون ملک جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک طرف ان کی ناقابلیت کا نتیجہ ہے اور دوسری طرف بین الاقوامی اشتراکی شرپسندوں کی فتنہ سامانیوں کا۔ استعمار نے ہزرگانہ شفقت سے اپنے سابقہ شکاروں کے کان میں پھونکا کہ وہ اشتراکی ممالک سے کسی قسم کا سروکار نہ رکھیں اور ہر طرح کی سیاسی، مالی، مشینی اور اخلاقی مدد کے لئے اس سے رجوع کریں۔ استعمار کو یوں غمگسار اور مہربان دیکھ کر ملکی حکمران مطمئن سے ہو گئے اور اپنی مشکلات اور ضروریات کے لئے اسی پر تکیہ کرنے لگے۔ یوں ملکی حکمران ایک طرح کے بھرت بن گئے اور استعمار کے رام کو اپنا باس ختم کرنے کی بالکل ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ اس کی کٹھ پتلیاں ہر خالی تخت تک پہنچ گئیں تھیں۔

ایشیا اور افریقہ کی غلام قومیں یکے بعد دیگرے آزاد ہوئیں تو وہ اس خوش فہمی کا شکار ہو گئیں کہ استعمار کا دور ختم ہو چکا ہے اور انسانی اقدار کا چلن ہونے لگا ہے۔ استعمار نے اس خوش فہمی کو ہوا دینے کے لئے پہلے جمعیت اقوام اور بعد میں اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارے متشکل کئے۔ ان کے متعلق بلند بانگ دعوے باندھے گئے اور انہیں اخلاق و اقدار کا حریم بنا کے پیش کیا گیا۔ نو آزاد ممالک اس عالمی سبز باغ میں گھوسے گئے اور اس چراگاہ میں بیٹھ کر خوب خوب اخلاق و اقدار کی جگالی کی۔ مثال کے طور پر پاکستانی مندوبین نے قومی حریت اور انسانی بھائی چارے پر پرزور خطبے دیئے اور انہیں عالمی سیاست کی اساس سمجھا اور سمجھایا۔ اس طلسم ہوش ربا کے بس منظر میں بین الاقوامی تعاون کا تصور ابھارا گیا اور استعماری قوموں نے اپنے ذمہ یہ فریضہ لے لیا کہ انہوں نے اپنی ہنرمندی اور شبانہ روز کی محنت سے جو دولت اور دولت آفریں ذرائع پیدا کئے ہیں، ان سے از روئے غریب پروری پسماندہ اقوام مشرق کو بہرہ یاب کریں گے۔ نو آزاد اقوام کے منہ اس کمال فیاضی اور ایثار پیشگی پر اس طرح کھلے کے کھلے رہ گئے کہ وہ ممنونیت کے مضطراب میں اپنی جان نذر دینی بھی بھول گئے۔ یوں وہی صورت پیدا کر دی گئی جو غلبہ استعمار کے وقت تھی۔ ہر استعماری قوم نے مقبوضہ علاقوں کو ایک طرف خام مال پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف اپنی مصنوعات کی کھپت کے لئے بلا مقابلہ منڈی۔ آزادی کے بعد استعمار نے بین الاقوامی تعاون کی جو صورت رائج کی اس کا بھی بعینہٖ یہی نتیجہ نکلا۔ آزاد ممالک کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ غریب اور پسماندہ ہیں اور ان کا بنیادی مسئلہ خوراک کا ہے لہٰذا وہ بڑی صنعتوں کے خواب نہ دیکھیں۔ یہ خواب بڑی قوموں ہی کو زیب دے سکتے ہیں۔ وہ زراعت پر زور دیں اور دولت، مشینوں اور ماہرین کی ضرورت کے لئے استعماری قوموں سے بے تکلفی سے رجوع کریں۔ جہاں تک خوراک کا تعلق ہے اس میں خود کفیل ہونے تک امیر ملکوں سے بلا جھجک خوراک حاصل کرتے جائیں۔ یہ افسوں پھونکنے سے آزاد ممالک کی حس آزادی بھی مجروح نہ ہوئی اور استعماری ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ لیکن آزاد ممالک کی معیشت میں اصلاً کوئی تبدیلی نہ آئی اور وہ پہلے کی طرح خام مال کی کھپت اور مصنوعات کی منڈی بنے رہے۔ اور

آج تک ہیں۔

سابقہ نوآبادیاتی ممالک کے استحصال کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جس سے ان کی معیشت کو پختہ بنیاد مہیا نہیں ہونے دی گئی اور انہیں مغرب کا مرہون منت ہی نہیں دست نگر بھی بنا دیا گیا۔ اس دوران زرعی پیداوار میں اضافہ بھی ہوا اور استعماری اقوام نے از رہ بندہ پروری اس خام مال کو روز افزوں مقداروں میں خریدا بھی۔ لیکن عملاً ہوتا یہ رہا کہ مقداروں میں تو اضافہ ہوتا رہا لیکن اس کی قیمتوں میں کمی واقع ہوتی گئی۔ مغرب کے امیر ملکوں نے بڑی چالاکی سے خام مال کی قیمتوں میں استحکام نہیں پیدا ہونے دیا۔ قیمتیں بالعموم گرتی رہیں اور برآمد کرنے والوں کو یہ سمجھایا جاتا رہا کہ وہ پیداوار اور بڑھائیں تاکہ اور زیادہ برآمد کر کے اپنی ضرورت بہتر طور پر اپنے ذرائع سے پوری کر سکنے کے قابل ہوں۔ یہ ایک ننانوے کا چکر رہا جو کبھی پورا نہ ہو سکا۔ ادھر خام مال کی قیمتیں گرتی گئیں اُدھر مشینوں اور مصنوعات کی قیمتیں بڑھتی گئیں۔ چنانچہ آزاد ممالک کی یہ حالت ہو گئی اور ہے کہ وہ خام مال کی پیداوار اور برآمد بڑھاتے چلے جا رہے ہیں لیکن جتنی قیمت وہ کبھی کہیں کم مقدار سے وصول کر سکتے تھے اب کئی گنا زیادہ مقدار سے وصول نہیں کر پاتے۔ اس بڑھتی پیداوار اور گھٹتی آمدنی سے ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہونا قدرتی ہے۔ لیکن ان کی پریشانی کی وجہ یہی ایک نہیں، اپنی معیشت کو جس طرح انہوں نے استعماری اغراض کے ماتحت کر دیا ہے اس سے وہ مصنوعات اور مشینیں خریدنے پر مجبور ہیں۔ یہ ضرورت کہیں زیادہ گراں بار بنا دی گئی ہے۔ جیسے جیسے خام زرعی مال کی قیمتیں گرتی چلی جاتی ہیں اسی طرح صنعتی درآمدات کی قیمتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ گویا ان ممالک کو مربی استعماری ملکوں سے وصول بہت کم ہوتا ہے اور انہیں ادا بہت زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کا حل ایک طرف یہ بتایا گیا کہ وہ پیداوار بڑھائیں اور برآمدات میں اضافہ کریں اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی مالی ضرورت کے لئے امیر ملکوں سے قرضے حاصل کریں۔ بین الاقوامی تعاون کی یہ صورت گمراہ کن بھی ہے اور انتہائی نقصان رساں بھی۔ یہ قرضے انفرادی طور پر امیر ممالک نے بھی دیئے، متعدد ممالک نے مل کر بھی دیئے اور اقوام متحدہ کے تحت معرض وجود میں لائے جانے والے اداروں کی طرف سے بھی موصول ہوئے، اور ہو رہے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ قرضوں میں نمایاں حصہ امریکہ کا ہے۔ قرضوں کا یہ سلسلہ ایسا جال ہے جس کا ایک ایک حلقہ بڑی عیاری سے تیار کیا گیا ہے۔ قرضے دینے والے ادارے — جو بالآخر زیادہ سے زیادہ امریکہ کی حدود میں محدود ہو جاتے ہیں — قرضہ دینے سے پہلے قرض خواہ ملک کی ضرورت کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے ماہرین بھیج کر ان کی معیشت میں دخیل ہی نہیں ہوتے عملاً حکمران بن جاتے ہیں۔ فیصلہ آخر کار ان کا ہوتا ہے کہ کون سا منصوبہ کس ملک کے لئے قابل عمل اور مفید ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک وہی منصوبہ قابل عمل اور مفید ہو سکتا ہے جو ان کے لئے مفید ہو اور جو ان کے معاشی اور استعماری تقاضے

پورے کرے۔ یہ بالکل حیران کن نہیں کہ قرض دہندوں نے قرض خواہوں کے ایسے ایسے منصوبے قلم زد کئے جو ان کی معیشت کو پختہ بنیاد مہیا کرنے کا موجب ہو سکتے تھے۔ کوئی ملک فولاد کے کارخانوں کے بغیر آزاد اور پختہ بنیاد صنعتی ترقی کا تصور نہیں کر سکتا۔ پاکستان مثال کے طور پر اس بنیاد سے آج تک محروم ہے۔

قرضوں سے قرض خواہوں کی معاشی ترقی رکی ہی نہیں گئی، ان کی معیشت کو اور زیر بار بھی کیا گیا۔ ایک تو قرض دینے سے پہلے حکمِ ان کے فیصلہ دیا گیا کہ کون سا منصوبہ کسی ملک کے لئے مفید ہے۔ دوسرے قرض کے ساتھ طرح طرح کی ظاہر اور مخفی شرطیں لگائی گئیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قرضے سیاسی و استعماری ضرورت کے تحت دیئے گئے اور قرض خواہ ممالک کو ایسی شرائط کا پابند بنایا گیا جو ان کی آزادروی کی تحدید کرتی تھیں۔ یہ مخفی سیاسی دباؤ کم ناجائز نہیں لیکن ظاہری معاشی سودا بازی بھی بڑی ہلا جواز ہے۔ جو قرض دیا جاتا ہے اس کی ایک شرط یہ ہوتی ہے کہ اس سے مال قرض دہندہ کے ہاں سے ہی خریدا جائے۔ یہ خریداری لامحالہ غیر معاشی اصولوں پر ہوتی ہے کیونکہ خریدار ایک ہی ملک سے خریدنے پر مجبور ہے۔ اسے معمولی مال بڑے مہنگے داموں خریدنا پڑتا ہے۔ اس جبری خریداری کے بعد یہ شرط سامنے آتی ہے کہ اسی ملک کے جہازوں میں سامان اپنے ملک تک لے جایا جائے۔ خریدار ملک کے اپنے جہاز بھی ہوں تو وہ انہیں استعمال نہیں کر سکتا۔ یہ پابندی لگنے کے جہازوں کے کرائے بلاوجہ بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ یہی نہیں مشینوں کے نصب کرنے اور دیکھ بھال کے لئے قرض دہندہ کے ایسے ماہرین قبول کرنے پڑتے ہیں جو ماہر کم اور نجبت زیادہ ہوتے ہیں۔ انہیں شہزادوں کی طرح رکھا جاتا ہے۔ گراں بہا مشاہرے، رنگا رنگ مراعات۔ یہ حساب لگایا گیا ہے کہ قرضے کا کم و بیش اسی فیصد حصہ قرض دہندہ ہی کی نذر ہو جاتا ہے۔ قرض خواہ کی مصیبت یہیں ختم نہیں ہوتی۔ قرض کی ادائیگی کمرشکن بنا دی جاتی ہے کیونکہ سود کی شرح غیر معمولی رکھی جاتی ہے۔ اس لین دین ر دینا زیادہ اور لینا کم ہیں ہیں اور لعنت بھی آتی ہے۔ خلا بند ہونے لگا تو وہاں ایک مخصوص آبادی معرضِ وجود میں آگئی جسے "چھوٹا امریکہ" کہا جاتا تھا۔ اس میں عام داخلہ ممنوع تھا۔ ایسی صورت قومی خودداری کے بھی منافی ہوتی ہے اور گوناگوں معاشی اور معاشرتی خرابیوں کو بھی جنم دینے کی ذمہ دار ہو جاتی ہے۔

اتنا کچھ کر لینے کے باوجود استعماری ممالک اپنے سرمائے کا پورا استعمال نہیں کر پاتے۔ انہیں اور طریقوں سے سرمایہ برآمد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ان طریقوں کے ذریعے وہ اپنی سیاسی، معاشی اور استعماری اغراض پوری کرتے ہیں۔ قرضوں کے ساتھ آزاد ممالک میں نجی کمپنیاں بھی اپنا سرمایہ لے کر پہنچ جاتی ہیں۔ وہ اپنے طور پر بھی کارخانے لگاتی ہیں اور ملکی سرمایہ داروں سے اشتراک کر کے بھی کام شروع کرتی ہیں۔ وہ ظاہر یہ کرتی ہیں۔ اور اس کا احسان جتاتی ہیں کہ وہ ملکی معیشت کو فروغ دینے اور اہلِ ملک کو فنی تجربہ اور روزگار کے مواقع مہیا

کرنے کے لئے سات سمندر پار سے آئی ہیں لیکن ان کی ضرورت اور مجبوری کہیں مختلف ہوتی ہے۔ ان میں ایسی کمپنیاں بھی ہوتی ہیں جو ظاہراً تجی لہذا غیر سیاسی اور غیر مشتبہ ہوتی ہیں لیکن درصل وہ جاسوسی اڈے ہوتے ہیں۔ ان کے کارکن اپنے ملک کے جاسوسی اداروں کے اعلیٰ اور تجربہ کار عہدے دار ہوتے ہیں۔ اور جس ملک میں کاروبار شروع کرتے ہیں اس میں جاسوسی کرتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں صرف متعلقہ ملک تک ہی محدود ہو سکتی ہیں اور دیگر ہمسایہ ممالک تک بھی وسیع ہو سکتی ہیں۔ جو کمپنیاں جاسوس نہیں ہوتیں ان کے پسماندہ ملک میں کاروبار کرنا غیر معمولی منافع کا سودا ہوتا ہے۔ ان کے اپنے ہاں مقابلہ شدید اور کارکنوں کی بڑھتی ہوئی اجرتوں اور خام مال کی گرانی کی وجہ سے ان کا منافع محدود ہو چکا ہوتا ہے وہ نو آزاد ملک میں پہنچ کر اسے باور تو یہ کراتے ہیں کہ وہ اس کی معاشی ترقی کے خواہاں ہیں لیکن ان کی نظر اس ملک کی غربت پر ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں مقامی خام مال بھی سستے داموں مل جاتا ہے اور مزدور بھی بہت کم اجرت پر میسر آجاتے ہیں۔ یوں ان کی لاگت بہت کم اور منافع کی شرح بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک طرف متعلقہ ملک کو دھوکہ دیتے ہیں کہ جو مال وہ تیار کر رہی ہیں وہ اسی ملک کا ساختہ ہے اور دوسری طرف وہ ہمسایہ ملکوں میں اپنے مال کو ایک ہمسایہ ایشیائی یا افریقی ملک کا مال کہہ کے بیچتی ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ نو آزاد ممالک میں استعماری ممالک کے خلاف ایک طرح کا احتجاج ابھرنے لگا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے کسی ایک استعماری ملک کے مال کا بائیکاٹ بھی کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس مال کو کسی اور ملک کا ساختہ بنایا جا سکے تو اس کے بائیکاٹ کا سوال کم و بیش خارج از بحث ہو جائے گا۔ مقامی حکومتیں بالعموم ان کمپنیوں کی حکومتوں کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ اور ان کمپنیوں کے عہدیداروں کی مقامی حکومتوں تک رسائی بھی ہوتی ہے اور ان پر دباؤ بھی۔ اپنے آپ کو مستحکم اور مؤثر بنانے کے لئے یہ کمپنیاں مقامی سرمایہ داروں سے اشتراک کریں تو ایسے سرمایہ دار منتخب کرتی ہیں جو ان کے مفاد کے نمائندہ ہوں اور اپنے مفاد کو اس حد تک کمپنی کے مفاد سے وابستہ کر لیں کہ ملکی مفاد پر غیر ملکی مفاد کو ترجیح دینے لگیں۔ اگر یہ کمپنیاں سرمایہ داروں سے اشتراک نہ کریں تو ایسے مقامی افراد کو اپنے ہاں نمائشی ملازمتیں دیتی ہیں جو ذی اثر ہوں، سرکاری افسروں سے کام نکال سکتے ہوں اور کمپنی کے مفاد کو اس حد تک اپنا مفاد سمجھنے لگیں کہ ان کے نزدیک ملک کے لئے وہی کچھ بہتر ہو جو کمپنی کے لئے بہتر ہو۔

استعمار کے حربوں کا یہ کسی طور مکمل جائزہ نہیں۔ اس بحر بیکراں کے لئے تو ایک نہیں کئی سفینے چاہئیں جتنا اور دوسرے راستے ایسے ہیں جن سے استعمار ظاہراً جا کے واپس آتا ہے۔ وہ واپس اس انداز سے آتا ہے کہ اس کا روپ استعماری نہیں ہوتا اور یوں لگتا ہے کہ آزاد ممالک آپس میں آزادانہ اور مساوی معاہدہ کر کے ایک ملک کو جیسے

غیر ترقی یافتہ کہلاتا تھا اور اب اسے ترقی پذیر کا برتر درجہ دے دیا گیا ہے، افلاس، جہالت اور پسماندگی سے نجات دلائیں گے۔ استعمار ان راستوں سے واپس آکر آزاد ممالک کو عملاً نوآبادیات بنا دیتا ہے۔ عملاً نوآبادی بننے اور بنے رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں وہی سیاسی اور معاشی نظام رائج رہے جو استعمار نے رائج کیا تھا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آنے دی جائے۔ کیونکہ یہ امکان خارج از بحث نہیں قرار دیا جا سکتا کہ کوئی ملک استعمار کی چال سمجھ جائے اور خودداری اور خود اعتمادی کا راستہ پاکر قومی کردار کا ایسا مظاہرہ کرنے پر آجائے جو استعمار کی پسپائی کا پیش خیمہ ہو۔ اس کا امکان کہیں زیادہ قوی ہو گیا ہے کیونکہ استعمار کو اسی طرح چین سے بے دخل اور پسپا ہونا پڑا اور جنوب مشرقی ایشیا سے اس کی پسپائی یقینی سی ہو گئی ہے۔ یہ اہتمام کرنے کے لئے سرکاری افسروں، کارخانہ داروں، تاجروں، دانشوروں، طالب علموں میں سے افراد چن چن کر ان پر الطاف و عنایات کی بارش کی جاتی ہے۔ انہیں اپنے ملک میں لے جایا جاتا ہے سیر کرائی جاتی ہے، عیش کرائے جاتے ہیں، ممنونِ کرم بنایا جاتا ہے۔ اس عیش سے انہیں اپنی جنت میں لے جایا جاتا ہے اور ایسی فضا برقرار رکھی جاتی ہے جس سے عیش کی مسلسل طلب رہے اور جنت کے میوے ہر وقت آنکھوں میں سمائے رہیں۔ تعلیمی، ثقافتی، اطلاعاتی اداروں کے فرائض میں استعماری مقاصد کی تکمیل واحد نہیں تو سرفہرست فریضہ ہوتا ہے۔

ایشیا میں یہ راز کھلتا جا رہا ہے کہ استعمار اس سے کیا سلوک روا رکھ رہا ہے اور کن مقاصد کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ یہ راز نہ بھی کھلے تو یہ امر ضرور روشن ہوتا جا رہا ہے کہ آزادی سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں بلکہ الٹی پریشانیاں بڑھ گئی ہیں اور دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس قدرتی ہیجان و اضطراب سے یہ آوازیں بھی اُبھرنے لگیں کہ اصل مسئلہ معاشرے کی منصفانہ تشکیل نو ہے۔ اس سے بہت سے ملکوں میں اندرونی تصادم کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایسی عوامی قوتیں ابھرنے لگی ہیں جو اپنے حکمرانوں کے منہ آنے لگی ہیں۔ حکمران بالعموم استعمار کے منظورِ نظر ہیں، اور ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ وہ بالکل مطمئن رہیں اور ہر قسم کی ضرورت کے لئے دوست (استعماری) ملک پر تکیہ کئے رکھیں۔ استعماری ملک انہیں دفاع کے لئے اسلحہ دے گا، صنعتی ترقی کے لئے مشینیں دے گا، ماہرین دے گا، سرمایہ دے گا، زرعی کمی دور کرنے کے لئے خوراک تک مہیا کرے گا۔ ایسے حکمران استعمار کے ممنونِ احسان اور دستِ نگر ہو جاتے ہیں اور وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ ملک کی غالب اکثریت جو غریب کسانوں پر مشتمل ہے، اس کا چنداں خیال نہ کریں اور ملکی ضرورت "دوست" ممالک سے پوری کر لیں۔ چنانچہ ان ملکوں میں ایسے اعلانات بار ہا ہوتے ہیں کہ خوراک کی ضرورت اندرونِ ملک سے پوری تو نہیں ہو رہی لیکن درآمد کردہ غلے کے ذخائر موجود بھی ہیں اور مزید درآمد جاری بھی ہے۔ اسے سب اچھا ہے "سمجھ" اور سمجھا تو لیا جاتا ہے لیکن کسانوں، مزدوروں اور دیگر کارکنوں ایسے دستِ دولت آفریں سے مسلسل عدم توجہی کا یہ

نتیجہ نکلتا ہے۔ جیسا کہ کئی ممالک میں نکلنے لگا ہے کہ وہ پریشان ہو کر احتجاج اور مظاہروں پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ احتجاج استعمار اور استعمار کے پروردہ نظام کے خلاف ہوتا ہے لیکن حکمران اسے اپنے خلاف سمجھنے لگتے ہیں اور سختی سے دبانے کی سوچتے ہیں۔ اس سے تصادم کی ایسی صورت ابھرتی ہے جو خانہ جنگی دکھائی دیتی ہے اور جاری رہے تو خانہ جنگی بن جاتی ہے۔ چین میں بالکل یہی کچھ ہوا۔ احتجاج کرنے والے لُٹے۔ انہیں شر پسند، معاشرہ دشمن اور غدار کہا گیا۔ آج یہی قیادت چین میں برسرِ اقتدار ہے اور اپنے کردار کی بنا پر عالمی توجہ کا مرکز بن چکی ہے۔ مغرب کی توجہ کا مرکز اس لئے کہ استعمار کو اس کردار میں اپنی شکست نظر آ رہی ہے۔ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی توجہ کا مرکز اس لئے کہ اس میں انہیں اپنی نجات کے لئے امید کی کرن دکھائی دینے لگی ہے۔

نو آزاد ممالک میں فرسودہ نظام کے خلاف احتجاج ابھرتا ہے تو استعماری ادارے طرح طرح سے سرگرم کار ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس سرمائے کی ویسے ہی کمی نہیں ہوتی۔ مقامی طور پر انہوں نے غیر معمولی سرمایہ مقامی زر کی شکل میں جمع کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ بھی عجیب دھوکہ ہے۔ نو آزاد ممالک کو جس طرح لوٹا جاتا ہے، اس کے پیشِ نظر ان کے پاس زرِ مبادلہ کبھی اتنا جمع نہیں ہو سکتا جس سے وہ مشینیں، مال اور خوراک خرید سکیں۔ اس موقعہ پر انہیں یہ چکمہ دیا گیا کہ وہ مثلاً خوراک کی رقم زرِ مبادلہ میں نہ دیں، اپنی زر کی شکل میں ہی ادا کر دیں۔ یہ آسان صورت ہے لیکن اس سے نوبت یہاں تک پہنچنے لگی کہ ملکی زر کا کثیر حصہ "دوست" ملک کے تصرف میں آ گیا۔ یہ دوست آزاد ہے کہ اس رقم کو جیسے چاہے خرچ کرے۔ یہ آزادی قانوناً نہ بھی ہو تو عملاً ضرور ہوتی ہے۔ یہ سرمایہ کارندے خریدنے میں بھی صرف ہوتا ہے اور ہنگامے کرانے میں بھی۔ نو آزاد ملک کی بے چینی کا فائدہ اٹھا کر ہنگاموں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ایسی صورتِ حال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے حکمرانوں کے دل میں یہ ڈر بٹھایا جا سکے کہ یہ طوفان قائدِ اشتراکیت یعنی چین کا اٹھایا ہوا ہے۔ لہٰذا انہیں اسے سختی سے کچلنا چاہیئے بلکہ چین سے بھی چوکنا رہنا چاہیئے۔ اور یا تو اس سے مراسم قائم ہی نہیں کرنے چاہئیں یا صرف ناگزیر حد تک رکھنے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسے سیاسی عناصر کی پرورش کی جاتی ہے جو بجاتے تو اسی کا ہیں جس کا کھاتے ہیں لیکن گاتے اس انداز سے ہیں کہ نئے اور نغمے سے لگتے ہیں۔ یہ عناصر اشتراکیت کو اپنے مزاج اور مذہب کے خلاف لہٰذا ممنوع قرار دیتے ہیں اور سیاست میں ایسی طرح ڈالتے ہیں جو حقیقی ملکی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر ایسے سیاسی اور تصوراتی امور کو ابھارتی ہے جو سعدی کے الفاظ میں 'آسمان کی طرف تو متوجہ کر سکتے ہیں کارِ زمین کا حسنِ انتظام نہیں کر سکتے'۔ یہی عناصر حکمرانوں سے مل کر استعماری نظام کی تقویت اور ملک میں فسطائیت کے چلن کے ذمہ دار بنتے ہیں۔ نو آزاد ممالک کے معاملات میں استعمار بہت حد تک دخیل ہے۔ کئی سیاسی حوادث اور حالات اسی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ بسا اوقات سیاسی تبدیلیاں تک اسی کی لائی ہوئی ہیں۔

کئی حکمران یا حکمرانوں میں طاقت ور عناصر استعمار ہی کے کارندے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی حکمران اپنے عوام سے روگردانی کرتے ہیں۔ جو حکمران اپنے عوام سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنے قیام اور استحکام کے لئے "دوست" ممالک پر تکیہ کرتے ہیں وہ استعمار کے کارندے اور عوام کے دشمن ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کی اسی روش سے چین کا انقلاب ابھرا، اور حکمرانوں کی یہی روش دوسرے ممالک میں انقلاب لانے کا موجب ہوگی۔ اقبالؒ نے سلطانئ جمہور کا جو زمانہ تصور میں آتا دیکھا وہ ہمارے سامنے آچکا ہے۔ زمانے نے یہ راز ایسے ابھار کے رکھ دیا ہے کہ اس کی صداقت اور بے پناہی میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک کی اصل طاقت عامۃ الناس ہیں۔ اور وہ بیدار اور منظم ہو جائیں تو کوئی اندرونی یا بیرونی طاقت ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ ایک وقت تھا کہ چین کی مصیبت کی وجہ یہ قرار دی جاتی تھی کہ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اب امریکہ اور روس جیسی عالمی طاقتیں چین کی طاقت کا راز اس میں سمجھتی ہیں کہ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ ناقابلِ شکست طاقت کا راز نہ آبادی کی کمی میں ہے نہ اس کی زیادتی میں۔ یہ راز آبادی کے بیدار اور منظم ہونے میں ہے۔ ویت نام اس کی زندہ مثال ہے۔ آبادی کے لحاظ سے امریکہ اور اس کے "اتحادی" ویت نام کو صفحۂ ہستی سے مٹا چکے ہوتے لیکن ویت نام نے ان کا جینا محال کر دیا ہے اور استعمار کی پسپائی کو نوشتۂ تقدیر بنا دیا ہے۔ عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنا، انہیں اعلیٰ اقدارِ انسانیت سے روشناس کرانا، انہیں احتیاجات سے مستغنی کر کے ان کے جذبۂ خودداری کو ابھارنا، قانون کے احترام کا خوگر بنا کر ان میں صحیح تنظیم پیدا کرنا۔ اور پھر اس قسم کے عوام کی قوت پر اعتماد کرنا ——— یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

(پٰ)

طلوعِ اسلام کے ہر پرچہ کے ساتھ ایک مطبوعہ کارڈ منسلک ہوتا ہے۔ اس میں ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کی فہرست درج ہوتی ہے۔ ان کتابوں نے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جس قدر یہ تعلیم عام ہوگی اسی قدر ہماری قوم (بالخصوص نئی نسل) صحیح اسلام کے سمجھنے کے قابل ہوتی جائے گی۔ اور جس قدر آپ اس لٹریچر کو خود پڑھنے اور دوسروں تک پہنچانے میں کوشش کریں گے، اسی قدر یہ فکر عام ہوتی جائیگی۔ آپ اس کارڈ کو جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بغور پڑھیئے اور مطلوبہ کتابوں پر نشان کر کے اسے (بغیر ٹکٹ لگائے) ہمیں بھیج دیجئے۔ آپکی فرمائش کی تعمیل ہو جائے گی۔ واضح رہے کہ طلوعِ اسلام ایک مشنری ادارہ ہے جس کا مقصد صحیح قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے۔ اس مقصد میں آپ کا تعاون آپ کے لئے باعثِ سعادت ہوگا۔ والسلام!

(ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام)

بابُ المراسلات

(۱) کمائی میں فرق

سوال۔ قرآن شریف میں ہے کہ خدا نے مختلف افراد میں اکتساب رزق، یعنی کمائی کرنے کی استعداد مختلف رکھی ہے۔ جب صورت یہ ہے تو پھر ایک کے پاس زیادہ دولت ہو سکتی ہے اور دوسرے کے پاس کم۔ اسی کو امیری اور غریبی کہتے ہیں اور یہ تفاوت کمائی کی استعداد کے فرق کا فطری نتیجہ ہے۔ پھر اس فرق کو مٹایا کیسے جا سکتا ہے۔ جس کے پاس زیادہ دولت ہے اس سے زائد دولت لے کر دوسروں کو دے دینا، زبردستی نہیں ہوگی؟ کیا اسلام میں اس کی اجازت ہوگی؟

جواب۔ ان امور پر غور و فکر کرنے کے سلسلہ میں ہماری بنیادی دشواری یہ ہے کہ دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہے وہ اس قدر پرانا اور عالمگیر ہو چکا ہے کہ اس نے ایک گونہ مسلمہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان ہم اس سے ہٹ کر سوچنے کے عادی ہی نہیں رہے۔ "کمائی" کا تصور اسی نظام کا پیدا کردہ ہے۔ آیئے، ہم پہلے یہ دیکھیں کہ "کمائی" کہتے کسے ہیں؟

ایک مزدور دن بھر کام کرتا ہے اور اسے تین روپے ملتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک انجینئر کو سو روپیہ یومیہ مل جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہیں گے کہ انجینئر مزدور کے مقابلہ میں زیادہ کماتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرتا ہے اور کس اصول کے مطابق کرتا ہے کہ مزدور کو تین روپے روز ملنے چاہئیں اور انجینئر کو سو روپیہ یومیہ؟ بادنیٰ تدبر یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اجرتوں (یا معاوضہ) کا یہ تعین، طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کے مطابق ہوتا ہے۔ مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے اور مانگ کم اسلئے ان کی "قیمت" بہت کم پڑتی ہے۔ اس کے برعکس انجینئروں کی تعداد کم ہے اور مانگ زیادہ اس لئے ان کی "قیمت" زیادہ ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جائے (یعنی مزدوروں کی تعداد طلب کے مقابلہ میں کم ہو جائے اور انجینئروں کی زیادہ) تو انجینئر کی کمائی تین روپے روز ہو جائے اور مزدور کی سو روپے یومیہ۔ (چونکہ

آجکل ہمارے ہاں انجینئر، ڈاکٹر، وکلاء کی تعداد جس نسبت سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے اسی نسبت سے ان کی "کمائی" کم ہوتی جا رہی ہے) اس سے واضح ہے کہ "کمائی" "فی ذاتہٖ" (INTRINSICALLY) کوئی شے نہیں' اسے معاشرہ طلب و رسد کے تناسب سے مقرر کرتا ہے۔ اس لئے "کمانے کی استعداد" کے بجائے اگر کچھ "بنانے" یا "پیدا کرنے" کی استعداد کہا جائے تو یہ حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔ زمانہ قدیم میں جو بارٹر سسٹم (BARTER-SYSTEM) رائج تھا (جس میں سکوں کے عوض خرید و فروخت کے بجائے' اشیائے ضروریہ کا باہمی تبادلہ ہوتا تھا) اس میں' "دولت کمانے" کا تصور نہیں تھا، ضروریات پوری کرنے کا اہتمام ہوتا تھا۔

اس کے بعد آپ تصور میں لائیے ایسے نظام کو جس میں' معاشرہ کے تمام بچوں کو پرورش، تربیت اور تعلیم کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ (مملکت خود اس کا انتظام کرے)۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر "چھلنے" لگا دیئے جائیں جو مختلف بچوں کی ذہنی استعداد اور افتادِ طبیعت کی چھان بین کرتے جائیں۔ اس طرح رُکنے والے بچے رُکتے جائیں، آگے بڑھنے والے آگے بڑھتے جائیں۔ اور معاشرہ کی ضروریات کے مطابق انہیں مختلف مشغلوں کی تعلیم دی جائے۔ اس کے بعد معاشرہ 'تقسیم کار کے اصول پر' مختلف کام، مختلف نوجوانوں کے سپرد کرے۔ ان کا فریضہ' اپنا اپنا مفوضہ کام بطریقِ احسن' سرانجام دینا ہو۔ اس کام کے معاوضہ یا اجرت کا سوال سامنے ہی نہ آئے۔ وہ اپنا اپنا کام کریں اور معاشرہ ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرتا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ اس نظام کے مطابق' معاشرہ کے تمام امور کس خوش اسلوبی اور حسن کارکردگی سے تکمیل تک پہنچ جائیں گے اور وہ تمام خرابیاں کس طرح از خود دور ہو جائیں گی جو موجودہ نظامِ معیشت و معاشرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ قرآن کریم کا منتہیٰ ایک ایسے نظام کا قیام ہے جس میں "کمانے کی بجائے" "کام کرنے" کا اصول کارفرما ہو۔

باری تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر تمام بچوں کو تعلیم و تربیت اور پرورش کے مواقع یکساں حاصل ہوں' تو جن بچوں میں زیادہ استعداد کی نمود ہوگی' وہ ان کی اپنی کاریگری کا نتیجہ نہیں ہوگی۔ وہ ان میں بنیادی طور پر موجود ہوگی یا یوں کہیئے کہ وہ ایسے عناصر کا نتیجہ ہوگی جن میں ان کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اسے اصطلاح میں "موہبت" (یعنی خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا کردہ) یا "اللہ کی نعمت" کہا جاتا ہے۔ قرآنی نظام اور موجودہ معاشی نظام میں یہی اصولی فرق ہے۔ قرآن' موجودہ معاشی نظام کو "قارونیت" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب قارون سے کہا گیا کہ تجھے جو زیادہ دولت حاصل ہوتی ہے اسے دوسروں کی کمی پوری کرنے کے لئے کھلا رکھو تو اس نے کہا کہ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں۔ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (۲۸/۷۸) یہ دولت مجھے میری ہنرمندی اور چابکدستی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قارونی ذہنیت کے حاملین کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے۔ کہ اکتسابِ رزق

کی استعداد میں مختلف افراد میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ جن لوگوں میں یہ استعداد زیادہ ہوتی ہے وہ اس کے ماحصل کو اپنے زیردستوں کی طرف نہیں لوٹاتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح گدھا گھوڑا سب برابر ہو جائیں گے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان کی اس ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ استعداد کی یہ زیادتی ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔ خدا کی عطا کردہ ہے۔ (۱۶/۷۱) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا کی عطا کردہ نعمت ہے (۱۶/۷۱) استعداد کا یہ فرق، زیادہ دولت کمانے اور اس کا مالک بن جانے کے لئے نہیں، یہ محض اس لئے ہے کہ معاشرہ کے مختلف (چھوٹے بڑے سب) کام چلتے رہیں (۴۳/۳۲)۔ جب ذہنیت یہ پیدا ہو جائے کہ استعداد کی زیادتی میری اپنی زرخرید یا پیدا کردہ نہیں۔ یہ موہبت[1] خداوندی ہے، تو اس استعداد سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، انسان اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ وہ اسے ان کی طرف لوٹا دیتا ہے جنہیں کم استعداد حاصل ہوتی ہے۔ اور ایسا کرتے وقت اس کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹) اس کے لئے ہم تم سے نہ کسی قسم کا بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں۔ ذہنیت کی یہ تبدیلی ایمان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مومن اور کافر میں بنیادی فرق ذہنیت (نفسیات) ہی کا ہوتا ہے۔

لیکن جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا، اور کام کا معاوضہ طلب و رسد کے اصول کے مطابق، سکوں میں ادا کیا جاتا ہے، قرآن کریم اس دور کے لئے بھی احکام و ہدایات دیتا ہے۔ مال کو کھلا رکھنے کی تاکید، اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ اجتماعی امور کے لئے صرف کر دینے کی خاطر دے دینے کا حکم، یہ بنیادی تصور کہ مومن اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ یا یہ کہ دولت کو اوپر کے طبقہ ہی میں گردش نہیں کرتے رہنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی نوع کے احکامات ہیں، اس سے وہ اس تفاوت کو ابھرنے نہیں دیتا جو اختلافِ استعداد کی بنا پر (موجودہ معاشی نظام میں) کمائی کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب عبوری دور کے بعد قرآنی نظام اپنی آخری شکل میں قائم ہو جاتا ہے تو پھر یہ تفاوت خود بخود مٹ جاتا ہے۔

اب رہا آپ کا دوسرا سوال، کہ کیا کسی سے زائد دولت لے لینا، جبر نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے پہلے

---

[1] ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ تفاوتِ استعداد کے لئے کون کون سے عوامل و عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ اس وقت ہم صرف اس نکتہ تک محدود رہتے ہیں کہ یہ چیز فردِ متعلقہ کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ نہیں ہوتی یعنی اسکی اپنی ہوتی ہے۔ استعداد خود پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ محنت اور مناسب تعلیم و تربیت بچے کی بنیادی استعداد میں جلا پیدا کرتی ہے۔

یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام ہے کیا اور مسلمان کسے کہتے ہیں۔ اسلام ایک سوسائٹی متشکل کرنا چاہتا ہے۔ جس کے ممبروں کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط اور شرائط داخلہ قرآنِ کریم کے اندر مذکور ہیں۔ اسلام ان قواعد و ضوابط اور شرائط و حدود کو عام کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ نوعِ انسان میں سے جس کا جی چاہے ان شرائط کو قبول کر کے اس سوسائٹی کا ممبر بن جائے۔ اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں۔ اس میں ممبرشپ کی شرطِ اولین یہ ہے کہ ممبر بننے والا اس کا اعلان کرتا ہے کہ میں نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے (۹/۱۱۱) اور اس کے قواعد و ضوابط میں لکھا ہے کہ ممبروں کے پاس جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو گا' وہ سوسائٹی (یا عالمگیر انسانیت) کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھا جائے گا۔ (۲/۲۱۹) اس سوسائٹی کی ممبرشپ قبول کرنے کا نام ذہنیت کی وہ تبدیلی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

اب آپ فرمائیے کہ اگر یہ سوسائٹی اپنے ممبروں سے' زائد از ضرورت مال طلب کرتی ہے تو کیا اسے جبر کہا جائے گا؟ بالخصوص جب اس کے ممبروں کو اس کا بھی حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں اس کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب ایک شخص اس سوسائٹی کا ممبر رہے گا' اسکے قواعد و ضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہو گی۔ اس کی اجازت تو کوئی سوسائٹی بھی نہیں دے گی کہ اس کا ممبر ہوتے ہوتے اس کے قوانین و ضوابط سے سرکشی برتی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ جب تک وہ زکوٰۃ کے اونٹ کی رسی تک ادا نہ کر دیں گے' میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔

لیکن جب نہ سوسائٹی ہو نہ اس کے ممبر ۔ کرنے کے باہر بس ایک سائن بورڈ لٹک رہا ہو' تو پھر تو کسی سے ماہانہ چندہ مانگنا بھی جبر کہلائے گا۔

(۰)

۲۔ ہمارا تاریخی ورثہ

سوال:۔ ہماری سب سے پہلی تاریخ (تاریخ طبری) تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی' اور وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ سے نہیں' بلکہ زبانی روایات کی رو سے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے کا تاریخی ریکارڈ موجود ہی نہیں تھا یا ان حضرات کو وہ ملا نہیں تھا؟

جواب:۔ ہمارے جامعین احادیث اور مؤرخین نے (ان کے بیانات کے مطابق) بڑی سعی و کاوش سے مواد اکٹھا کیا۔ اس کے لئے انہوں نے دور دراز کے سفر اختیار کئے' سینکڑوں' ہزاروں افراد سے ملے۔ اگر تحریری ریکارڈ کہیں موجود ہوتا تو وہ یقیناً اسے حاصل کر لیتے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ تحریری ریکارڈ

کہیں تھا ہی نہیں۔ اس لئے انہوں نے زبانی روایات کی بنا پر احادیث کے مجموعے اور تاریخ مرتب کی۔

اس سلسلہ میں ایک بات بڑی غور طلب ہے۔ مدینہ ہماری سب سے پہلی اسلامی مملکت کا دارالخلافہ تھا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ مملکت قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی وسعت قریب بائیس لاکھ مربع میل تک چلی گئی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس کی حدود دور دراز تک پھیل گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے کاروبار کے لئے کوئی سیکریٹریٹ ہوگا۔ محکمہ مال ہوگا۔ صوبوں کے گورنروں سے امور مملکت کے سلسلہ میں خط و کتابت ہوتی ہوگی۔ داخلی امور حکومت کے متعلق احکامات جاری ہوتے ہونگے۔ دیگر مملکتوں کے سفراء اور قاصد آتے جاتے ہونگے۔ فوج سے متعلق امور سرانجام پاتے ہونگے۔ یہ سب کچھ تحریری طور پر ہوتا ہوگا۔

دوسری طرف اسے بھی پیش نظر رکھیئے کہ رسول اللہ کے زمانے سے لے کر آج تک مدینہ پر مسلمانوں کا تسلط رہا ہے۔ کسی غیر مسلم کے قدم اس سرزمین پر نہیں پڑے۔ وہاں کوئی ایسا زلزلہ نہیں آیا جس سے عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں۔ کوئی سیلاب نہیں آیا جس سے شہر غرقاب ہو گیا ہو۔ کوئی ایسی آگ نہیں لگی جس سے وہ بستی خاکستر ہو گئی ہو۔ کوئی فوجی یورش ایسی نہیں ہوئی جس سے اس پر تباہی آگئی ہو۔

لیکن ان تمام امور کے باوجود، اس مملکت کے کاروبار سے متعلق کوئی پرزہ کاغذ کہیں نہیں ملتا۔ نہ مدینہ میں ملتا ہے نہ کہیں باہر۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت سے متعلق تحریری ریکارڈ کہاں چلا گیا؟ وہ کہاں گم ہو گیا؟ اسے کون لے گیا۔ وہ کیسے ضائع ہوا؟ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ تاریخ کے متلاشیوں کو بحر میت کے کنارے حضرت مسیح کے زمانے سے بھی قبل کے مخطوطات (SCROLLS) تک مل گئے۔ مکتشفین کو بابل اور نینوا کے کھنڈرات سے حمارابی تک کے زمانے کے احکام و قوانین کا پتہ چل گیا۔ مصر کی قدیم تہذیب کے متعلق چٹانوں پر کندہ اور دیواروں پر منقوش مواد مل گیا لیکن مدینہ کی مملکت سے متعلق تحریر میں ایک لفظ تک کہیں سے دستیاب نہیں ہوا۔

اور آگے بڑھئے۔ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کا دارالخلافہ دمشق میں منتقل ہو گیا۔ اور وہاں قریب ایک سو سال تک اموی حکومت کا راج رہا۔ وہ اس زمانے کی سب سے بڑی بین الاقوامی مملکت تھی۔ اس حکومت سے متعلق بھی اصلی (ORIGINAL) ریکارڈ کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں چلا گیا؟ اور جنرل ریکارڈ تو عباسی حکومت کا بھی نہیں ملتا۔ اس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بغداد کی تباہی میں تلف ہو گیا ہوگا۔ لیکن مدینہ اور دمشق کے متعلق تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔۔۔ بالخصوص مدینہ کے متعلق کہ وہاں کی حکومت (عہد رسالت مآبؐ اور خلافت راشدہ کی حکومت) اور اس کے متروکات

کے ساتھ تواتر کی عقیدت و ارادت بھی وابستہ تھی۔ پھر اس تحریری ریکارڈ کو کیا ہوا؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، تاریخ کے کسی محقق نے اس کے متعلق تحقیق ہی نہیں کیا کہ یہ ریکارڈ چلا کہاں گیا!

اس کے بعد آپ غور فرمایئے کہ جس تاریخ کے اور جنبل ماخذ کی یہ کیفیت ہو اسے کس حد تک قابلِ اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے؟ اُس دور کا ایک ہی تحریری سرمایہ ہے جو ہم تک محفوظ چلا آرہا ہے۔ اور وہ ہے قرآنِ کریم۔

(۰۰)

پاکستان میں نظامِ زکوٰۃ

سوال:۔ پاکستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر کارنیلیس نے اگلے دنوں تجویز کیا ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ پانچ سالہ بانڈز کی شکل میں جمع کر کے خیرات کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ کارنیلیس صاحب اسلامی امور کے متعلق اکثر تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کارنیلیس صاحب عیسائی ہیں اور چونکہ عیسائیت ایک مذہب ہے اسلئے وہ اسلام کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، اسے ایک مذہب سمجھ کر ہی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ مذہب میں (بائبل کے الفاظ میں) قیصر کا حصہ قیصر کو دیا جاتا ہے اور خدا کا حصہ خدا کو۔ لیکن دین میں اس قسم کی ثنویت (DUALISM) کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ اسلام میں زکوٰۃ انفرادی خیرات کا نام نہیں۔ اسلامی حکومت کی پوری کی پوری آمدنی کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جس سے وہ حکومت افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کا فریضہ ادا کرتی ہے (یہی زکوٰۃ کے لفظی معنی بھی ہیں) اس لئے اس کی وصولی یا خرچ کے لئے اسلامی حکومت کو کوئی جداگانہ انتظام نہیں کرنا ہوتا۔ کارنیلیس صاحب کو اس باب میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اس کے ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جو اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور حکومت کی طرف سے عاید کردہ ٹیکسوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ان لوگوں کے ذہن میں بھی خدا اور قیصر کی ثنویت سمائی ہوئی ہے۔ دین کا تصور ان کے سامنے بھی نہیں۔

حقائق و عبر

از ڈاکٹر ذاکر حسین خان (مرحوم)

پچھلے دنوں بھارت دیش کے راشٹرپتی' ڈاکٹر ذاکر حسین خان' نئی دہلی میں سرگباش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب' نہایت شریف النفس انسان' بڑے قابل معلم' انگریزی' اردو' دونوں زبانوں میں خوش گفتار اور شاداب قلم۔ دُھن کے پکے۔ تمدنت شعار' مسلمان حکمرانوں کی قدیم روایات کے شگفتہ پیکر۔۔۔ لیکن قوم کی بدقسمتی کہ ڈاکٹر صاحب اُٹھے اور اپنی ان تمام خوبیوں کو گاندھی جی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا۔ اور ملّت پکارتی رہ گئی کہ

وفا آموختی از ما' بکارِ دیگراں کردی

ربودی گوہرے از ما' نثارِ دیگراں کردی

جامعہ ملیّہ کی تاسیس' مولانا محمد علی جوہر (مرحوم) جیسے شیدائی ملّت نے رکھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُسے نیشنلسٹ (ہندو قومیت پرست) نوجوانوں کی پرورش گاہ بنا دیا۔ چنانچہ یہ درسگاہ' جس میں اُس زمانے میں صرف مسلمان طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے' کانگریسی راہ نماؤں کی فکری سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی۔ کانگریس ۔۔۔ اور اس کے سربراہ' گاندھی جی ۔۔۔ کا مقصود و منتہیٰ یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کر کے' انہیں ہندو قومیت میں جذب کر دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے مختلف تدبیریں سوچیں اور متنوع حربے استعمال کئے۔ ان حربوں میں سب سے زیادہ خطرناک حربہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نکال دیا جائے کہ اسلام کو دیگر مذاہب (بالخصوص ہندو دھرم) کے مقابلہ میں کوئی افضلیت حاصل ہے۔ اس مقصد کے لئے (مولانا) ابوالکلام آزاد نے قرآن کی وہ برہمو سماجی تفسیر لکھی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رام بھی وہی ہے اور رحیم بھی وہی' اور کسی مذہب کو دوسرے مذاہب سے افضل قرار دینا' خلافِ اسلام ہے۔ کانگریس کی طرف سے اس تفسیر کی عام اشاعت ہوئی تھی۔

اسی سازش کی دوسری شاخ یہ تھی کہ آنے والی نسلوں کو تعلیم اس قسم کی دی جائے جس سے مسلمان بچوں کے دل سے شروع ہی سے اپنے جداگانہ تشخص کا تصور محو ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے گاندھی جی نے ایک کمیٹی تشکیل کی جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خان تھے۔ اس کمیٹی نے تعلیم کا ایک مبسوط منصوبہ تجویز کیا جو ملک میں "وار دھا کی تعلیمی اسکیم" یا "ودیامندر" کے نام سے متعارف ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس اسکیم کو "مہاتما گاندھی" کی خدمت میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

> اور میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مہاتما گاندھی کی سوجھ بوجھ اور راہ نمائی آڑے وقت میں ہمارے کام آئی۔ (رپورٹ ص۱۱)

اس اسکیم میں مسلمانوں کے لئے کس قسم کا مہلک زہر چھپا ہوا تھا' اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہوں نے اس زمانے میں اس کا مطالعہ کیا تھا۔ ہم اس حقیقت کا اظہار بطور خود ستائی نہیں بلکہ بہ رنگ تحدیثِ نعمت کرتے ہیں کہ مبداء فیض کی کرم گستری نے یہ سعادت طلوعِ اسلام کے حصہ میں رکھ دی کہ اس نے اس اسکیم کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اس کی دھجیاں فضائے سیاست میں بکھیر کر رکھ دیں۔ جن حضرات کے پاس اس زمانے کے طلوعِ اسلام کے فائل موجود ہیں' وہ اگست ۱۹۳۸ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں قریب چالیس صفحات پر مشتمل مقالہ میں اس اسکیم کا بھرپور جائزہ لیا گیا تھا۔ وہ مقالہ اس قدر مقبول ہوا کہ ملک کی پانچ چھ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور ہزارہا کی تعداد میں تقسیم ہوا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس تعلیمی اسکیم کی روشنی میں تیار کردہ نصاب کی کتابیں ساحلِ بمبئی سے سمندر کی نذر کرنی پڑیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنی اس قومیت پرستی کا پہلا صلہ تقسیمِ ہند کے زمانہ میں ملا۔ وہ ۱۹۴۷ء میں (جب ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں کے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا) ٹرین میں سفر کر رہے تھے، کہ جالندھر کے اسٹیشن پر سکھ بلوائیوں نے انہیں گاڑی سے اتار لیا۔ وہ لاکھ کہتے رہے کہ وہ کون ہیں لیکن اس کا جواب یہی ملا کہ وہ کچھ بھی ہوں، نام تو ان کا مسلمانوں کا سا ہے۔ اس لئے انہیں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ اتفاق سے کوئی فوجی افسر ادھر آ نکلا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کی جان بچالی۔ ورنہ ان کے "ہم قوم" (ہندو اور سکھ) انہیں وہیں ختم کر دیتے۔ لیکن افسوس کہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے بھی عبرت حاصل نہ کی اور آخر تک اسی قوم کا جزو بنے رہے' اگرچہ حالت وہاں یہ تھی کہ کانگریس انہیں ایسے حلقہ نیابت سے بطور امیدوار کھڑا نہ کر سکی جس میں ہندو اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی ہو۔ انہیں ایسے حلقہ سے کھڑا کیا جس میں رائے دہندگان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ آخر میں' ہندو سیاست کی مصلحت کوشیوں نے انہیں مملکت کا صدر بھی بنا دیا۔ یہ صدارت ویسی ہی تھی جیسی (مولانا) آزاد کی کانگریس

کی صدارت جس پر قائداعظمؒ نے انہیں (SHOW BOY) کے لقب سے مخاطب کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے عہد صدارت میں وہاں کے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی تھی اس پر ان کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ ـــــ ملک ملک دیدم دم نکشیدم ـــــ ہو سکتا ہے کہ ان کی حرکت قلب کا بند ہو جانا ان کے اسی احساس مسلسل اور ضیق پیہم کا مجموعی تاثر ہو۔

ہم نے مرحوم کی یاد میں یہ سطور انتہائی قلق اور دل گرفتگی کے ساتھ سپرد قلم کی ہیں کہ ملت کا ایک جوہر قابل یوں نصیب دشمناں ہو کر ضائع ہو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الالباب۔

ــــــــــ(۰)ــــــــــ

۲۔ خدا کی آواز

علامہ اقبالؒ کے صاحبزادہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے لاہور میں یوم اقبال کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

> علامہ کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دل و دماغ سے غیر اللہ کا تسلط ختم کر کے صرف اللہ کی حاکمیت تسلیم کرے..... اللہ کی حاکمیت سے مراد عوام کی حاکمیت ہے۔ کیونکہ اللہ کی رضا کا اظہار ہمیشہ عامۃ الناس کی آواز کے ذریعے ہوتا ہے۔ (چٹان - ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ء)

یہ وہی "عامۃ الناس" کی آواز ہے جس کے متعلق خدا نے اپنے رسول سے کہا تھا کہ

> وَ اِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔ وَ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۷)
>
> اگر تو دنیا میں بسنے والوں کی اکثریت کا کہنا مانے گا تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔ وہ (حق و یقین کی نہیں بلکہ) ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور انکلیں دوڑاتے رہتے ہیں۔

اور جن کے متعلق ان کے (مقرر کے) والد ماجد کا ارشاد ہے۔

> کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید۔

خدا کی آواز عامۃ الناس کی آواز نہیں ہوتی۔ اس کی آواز صرف اس کی کتاب ـــــ (قرآن کریم) میں محفوظ ہے اور اسی (کتاب) کی حاکمیت کا نام خدا کی حاکمیت ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)
جو لوگ کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں کرتے، تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

---(٠)---

۳ - کارِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد ــــ (اقبالؒ)

ایک خبر کی سُرخی ملاحظہ فرمائیے ۔

انقرہ کی جامع مسجد کے امام نے اتاترک کے ایک ساتھی کا جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا ۔ (مشرق ۔ ۶۹/۵/۶)

خبر میں درج ہے کہ اتاترک کے ایک ساتھی عمران اوکتم کی میت نمازِ جنازہ کے لئے جامع مسجد میں لائی گئی تو خطیب نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس مرتد کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائیں گے اور نہ ہی کوئی دوسرا مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس پر اتاترک کے ایک اور ساتھی، جنرل عصمت انونو آگے بڑھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ جب تک عمران اوکتم کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی وہ گھر واپس نہیں جائیں گے۔ ان کے اس اعلان پر بہت سے لوگ جن کی داڑھیاں تھیں ان کی طرف بڑھے جب صورتِ حال نازک ہو گئی تو ترکی کی فوج کے جنرل نبی الپرتم نے پستول نکال لیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر کسی شخص نے ۸۵ سالہ جنرل انونو کو ہاتھ لگایا تو وہ گولی چلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس طرح جنرل انونو کو ہجوم سے بچا لیا گیا۔ بعد میں انقرہ کے مفتی اعظم نے فتویٰ دیا کہ اگر کسی مسلمان کی میت جنازے کے لئے لائی جائے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جانی چاہیئے۔ تاہم اگر کسی شخص نے خودکشی کی ہو تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ (ایضاً)

عمران اوکتم (مرحوم) کے متعلق تو اس وقت ذہن میں نہیں آتا کہ یہ کون صاحب[1] تھے۔ لیکن اتاترک اور عصمت انونو کے متعلق تو ایک دنیا جانتی ہے کہ اگر ۱۹۲۲ء میں یہ بزرگوار اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آگے نہ بڑھتے تو آج یہ خطیب صاحب اور ان کی مسجد اہلِ صلیب کے تسلط میں ہوتے۔ لیکن مُلّا کو اس سے کیا غرض ؟ اس کا کام تو مسلمانوں کو کافر اور مرتد قرار دینا، ان کی زندگی میں ان کی بیویوں پر طلاق وارد کرنا، اور مرنے کے بعد ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے کو ناجائز قرار دینا ہے ! اسی سے اُس کے اسلام کی شان و شوکت بڑھتی ہے (یا یوں کہیئے کہ اسکے جذباتِ نفرت و حقارت کی آگ ٹھنڈی پڑتی ہے)

---

[1] بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ وہ ترکی کی سپریم کورٹ کے صدر تھے۔

۴۔ قرآنی معاشرہ

ارشاد ہوتا ہے۔

قرآن کے پیشِ نظر ایسا معاشرہ بنانا نہیں ہے جس میں کوئی کسی کے ساتھ خود نیکی نہ کر سکے اور افراد کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا ہر کام ایک اجتماعی مشین کے ذریعے سے ہوتا ہے کیونکہ اس طرح کے معاشرے میں اخلاقی فضائل کے نشو و نما کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ بحوالہ ایشیا۔ ۳۰ مئی ۶۹ء)

اس کے معنی یہ ہوتے کہ (مثلاً) اگر مسلمان اپنی زکوٰۃ کا روپیہ الگ الگ کرکے ایک ایک پیسہ فقیروں کو دیتے جائیں تو یہ قرآنی معاشرہ ہوگا، اور اگر وہ اپنا روپیہ ایک نظام کے تابع اجتماعی تحویل میں دے دیں تاکہ وہاں سے ضرورت مند افراد کی مدد ہوتی رہے، تو یہ فعل غیر قرآنی ہوگا کیونکہ اس طرح "ان کے اخلاقی فضائل کے نشو و نما کا کوئی امکان نہیں رہتا"۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ سے کہا تھا کہ وہ زکوٰۃ کی رقم مرکزی بیت المال میں جمع کرائیں ورنہ ان کے خلاف جنگ کی جائے گی تو وہ (معاذ اللہ) ایک غیر قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی کوشش تھی؟ خود ان صاحب سے کوئی پوچھے کہ جب یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی قربانی کی کھالیں اپنے اپنے طور پر جزائی کاموں میں دینے کے بجائے "جماعتِ اسلامی کی "اجتماعی مشین" کے حوالے کریں تو ان کا یہ فعل قرآنی ہوتا ہے یا غیر قرآنی؟

آپ غور کیجئے کہ سوشلزم کا ہوا ان صاحب کے اعصاب پر کس بری طرح سے سوار ہے اور یہ چھلاوا ان سے کیا کچھ کہلوا رہا ہے؟

—————— (۰) ——————

۵۔ میخانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل

مذہبی پیشوائیت کی دنیا میں، پوپ بلند ترین تختِ اجلال پر متمکن ہے۔ وہ کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ پر ہی نہیں، ان کے جسم و جان پر بھی خدائی کرتا ہے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا دولت مند انسان ہے۔ اسکی دولت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں لیکن زمانے کے تقاضوں سے، اس کے قصرِ الوہیت میں کس طرح تزلزل آ رہا ہے، اس کا اندازہ اس مختصر، لیکن نقاب کشا مقالہ سے لگ سکتا ہے جو (CHARLES FOLEY) کے قلم سے، پاکستان ٹائمز کی ۵ مئی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اسی سے پوپ کی دولت کا بھی اندازہ لگ سکتا ہے

ذیل میں ہم اسکے مقالہ کے اہم حصوں کا رواں ترجمہ درج کرتے ہیں۔

"کیا پوپ پال (ششم) کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے؟ کیا اسکی روش نے عدم اعتماد کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جس سے اس کا برسر اقتدار رہنا، کلیسا کے مستقبل کے لئے خطرہ کا موجب سمجھا جانے لگا ہے؟"

یہ ہیں وہ سوالات جو احتجاج اور تنفر کے جذبات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ، کھلے بندوں (پوپ کی مملکت کے مرکز) ویٹیکن میں ہر طرف زبانوں پر آ رہے ہیں۔ (یہ نظارہ وہاں کھلے بندوں نظر آتا ہے) کہ ایک طرف پوپ کو شکایت پیدا ہو رہی ہے کہ اسکے احکام کی اطاعت سے گریز کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف یہ جذبات اُبھر رہے ہیں کہ اسے اس قسم کی اطاعت کے تقاضے کا حق ہی کیسے پہنچتا ہے۔ (اسکی بنیادی وجہ پوپ کی بے پناہ دولت و ثروت ہے) یہ وہ راز ہے جس کی بڑی شدت سے حفاظت کی جاتی ہے (کہ لوگوں کو معلوم نہ ہونے پائے) ممتاز ماہرین اقتصادیات کے اندازے کے مطابق، اس وقت پوپ کا کم از کم دو ارب پونڈ کا سرمایہ مختلف اقسام کے کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ پوپ، دنیا کا سب سے بڑا "اسٹاک ہولڈر" ہے۔ مسولینی کے ساتھ ایک معاہدہ کی رُو سے، پوپ کو اپنی ملک پر ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ لیکن اب اٹلی کی حکومت کا تقاضا ہے کہ اس سے ٹیکس لیا جایا کرے۔ (اس وقت اٹلی کی حکومت، عیسائی جمہوریت پسندوں، سوشلسٹوں اور ری پبلکن کے حامیوں پر مشتمل ہے) اس ٹیکس کی مقدار کم از کم اندازے کے مطابق بھی، دس لاکھ پونڈ سالانہ ہوتی ہے۔ پوپ اور اسکے رفقاء اس کوشش میں ہیں کہ اس دولت کو ٹیکس سے مستثنیٰ رہنے دیا جائے۔ اس مقصد کیلئے وہاں لوگوں پر ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ کلیسا بڑا غریب ادارہ ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ نہایت قیمتی موٹر کاریں، جو پوپ کے محلات کے لئے، قطار در قطار کھڑی رہتی ہیں، انکی اس کوشش کو ناکام بنا دیتی ہیں (اور یہ کوششیں کامیاب بھی کس طرح ہو سکتی ہیں جب کہ واقعہ یہ ہے کہ) اٹلی کی مملکت کے کل سٹاکس کے پانچویں اور دسویں حصہ کے درمیان، پوپ کی ملکیت ہیں۔ واضح رہے کہ اٹلی میں پوپ کی دولت کا بہت کم حصہ ہے۔ اس کی دولت کا معتد بہ حصہ بیرونی ممالک، بالخصوص شمالی امریکہ سے آتا ہے اور یہ دولت، رومن کیتھولک کلیسا کی بادشاہت کی آمدنی سے الگ ہے۔ پوپ کی امارت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر فورڈ موٹرس، شیل آئیل اور بیت اللحم کے فولاد کے کارخانے کی دولت کو یکجا کیا جائے، تو اس کا مجموعہ پوپ کی دولت کے برابر ہو سکیگا۔ اس میں وہ فنڈ شامل نہیں جو (PETER'S PENCE) کے نام سے ساری دنیا سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس فنڈ کو بھی صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے۔ کیتھولک کلیسا کی شاخیں تمام کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہیں (ان شاخوں سے وابستہ اسقف اور پادری، مسیح کے منادی ہی نہیں۔ یہ سب)

پوپ کو کاروباری معاملات میں صحیح مشورے بہم پہنچانے کا وسیع ترین ذریعہ ہیں۔ اس تمام دولت پر پوپ کو کلی اختیارات حاصل ہیں۔ وہ انہیں کس طرح خرچ کرتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ پوپ بنیڈکٹ (پنجدہم) کے میز کے دراز، نوٹوں سے بھرے رہتے تھے اور وہ ان میں سے بلاحساب و شمار دستیوں کی دستیاں بانٹتا رہتا تھا۔

پوپ کے خلاف، اس کے متبعین کی طرف سے، جو اعتراضات اور احتجاجات کی گنگناہٹ عام ہو رہی ہے، تو اس کا رُخ صرف اس کی کثیر دولت کی طرف نہیں، اس کے سیاسی اقتدار کی جانب بھی ہے۔ اٹلی میں حکومت، پوپ کے ساتھ اپنے روابط کو جدید خطوط پر متشکل کرنا چاہتی ہے اور دنیا کی ساٹھ کروڑ کیتھولک آبادی میں اس کے خلاف اعتراضات کی رو بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس مخالفت سے گھبرا کر، اگلے دنوں پوپ نے کہا تھا کہ (یہودیوں نے تو، بقول اس کے، مسیح کو صلیب دی تھی) یہ باغی، خود کلیسا کو سولی پر چڑھا رہے ہیں ـــــ وہ اس طرح اپنے غم و غصہ کا اظہار کر رہا ہے، اور معترضین اس کا جواب یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ ـــــ اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست!"

یہ ہے وہ بے حد و حساب دولت جو دنیا کے اس سب سے بڑے "راہب" نے جمع کر رکھی ہے۔ اور یہ ہے مخالفت کی وہ فضا جو اب اس کے خلاف پیدا ہو رہی ہے۔ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۹/۳۴) ان احبار و رہبان کو دیکھو۔ یہ دعوے تو کرتے ہیں تارکِ دنیا ہونے کا، اور حالت یہ ہے کہ لوگوں کی کاڑھے پسینے کی کمائی بلاغل و غش ہڑپ کرتے رہتے ہیں۔

باقی رہا مذہبی پیشوائیت کے خلاف، خود ان کے متبعین کی طرف سے اعتراضات پیدا کرنا اور احتجاج کی آوازیں اٹھنا، سو یہ زمانے کے تقاضے کا نتیجہ ہے جسے کسی کا جھوٹا تقدس اور شانِ الوہیت روک نہیں سکتی۔ قرآن نے، انسانوں کے وضع کردہ جس جس نظام اور ادارہ کو باطل کہہ کر پکارا تھا، اسے مٹ کر رہنا ہے۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ پوپ کے تصرِ خداوندی میں جو تزلزل آیا ہے، اس سے دنیا کے ہر مذہبی پیشوا کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ جب اتنے عظیم مذہبی مقتدار کی سیادت خطرہ میں ہے، تو چھوٹے چھوٹے مذہبی پیشوا کس باغ کی مولی ہیں۔ مذہبی پیشوائیت، خواہ وہ کسی مذہب کی ہو، باطل کا نظام ہے اور قرآن کے دعوے کے مطابق، اسے ختم ہو کر رہنا ہے۔

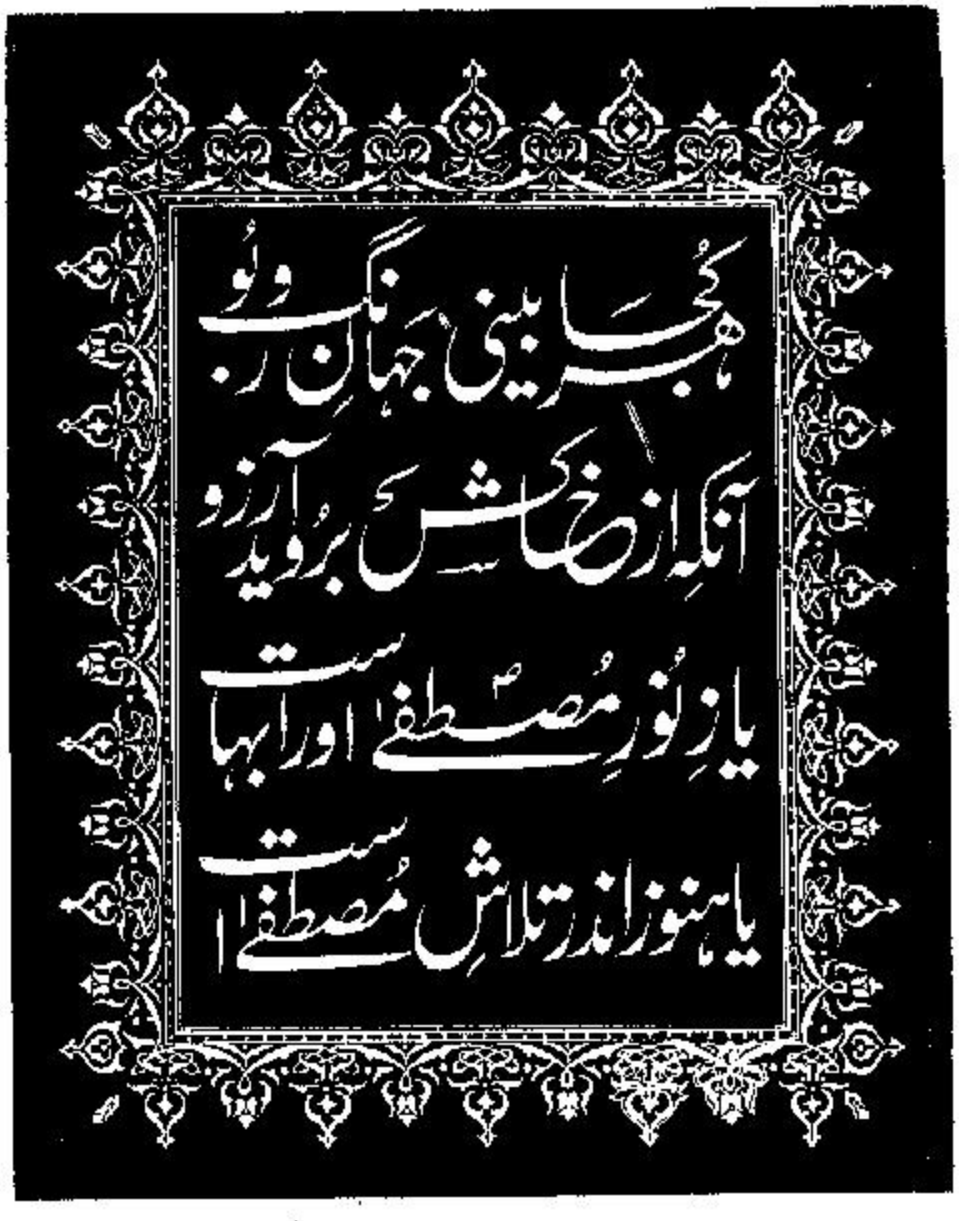
هر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است